بادِ نو بہار

(دیارِ ہندی میں فیض)

ہندوستانی ادب سیریز

بادِ نو بہار

(دیارِ ہندی میں فیض)

ادارت و ترجمہ

ظہور صدیقی

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

ISBN 978-81-237-6262-3

پہلا ایڈیشن: 2011 (ساکا 1933)

Bade Nou Bahar: Deyar-i-Hindi Mein Faiz (Urdu)

قیمت: 100.00

ناشر: ڈائریکٹر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

5، نہرو بھون، انسٹی ٹیوشنل ایریا، فیز–II

وسنت کنج، نئی دہلی–110070

انتساب

حق وصداقت کے لئے آواز
بلند کرنے والوں کے نام

اولین سطور

ظہور صدیقی

فیض پر بہت کچھ لکھنا باقی ہے اور یہ سلسلہ صد سالہ جشن کے ساتھ قطعی ختم نہیں ہوگا۔ آنے والے وقتوں میں فیض دانشوروں سے ہم کلام ہوتے رہیں گے۔ ان کے بارے میں، ان کے شعری شعور کی پرواز کو لیکر، اور ان کے فکر میں ڈوبے ہوئے جملوں کی وسعت پر چرچے ہوتے رہیں گے اور یہ سب کچھ ایک زبان یعنی اردو تک ہی محدود نہیں رہے گا۔ دنیا کی زبانیں ان کے شعروں کے قریب آتی جائیں گی۔

فیض کی زندگی میں بھی مختلف زبانوں نے ان کے شعروں کو اپنے ادب میں جگہ دی۔ ہندی کے قلمکاروں نے بھی نہ صرف ان کے اشعار کو چوما بلکہ اس پر لکھنا بھی شروع کیا اور جو لکھا بہت خوب لکھا۔ اب اس کی ایک چھوٹی سی جھلک قارئین کو اس کتاب میں نظر آئے گی۔

ہم ممنون ہیں ان سب ادیبوں کے جنھوں نے اپنی تخلیقات کو اس کتاب میں شامل کرنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ اس قدم کو بیحد سراہا۔ اردو کے قارئین جب ان ترجمہ شدہ مضامین کو دیکھیں گے تو نہ صرف یہ انہیں معیاری لگیں گے بلکہ دلنواز بھی۔ ان مضامین کے لکھنے والوں میں سے بیشتر ہندی ادب کے نامی گرامی رائٹرس ہیں۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر اسلم پرویز نے اپنے دیباچہ میں جو تحریر کیا ہے وہ مختصر ہوتے ہوئے بھی معنی خیز ہے اور پُر مغز بھی۔ اور اس طرح ہمارا کام آسان ہوگیا

کیونکہ بطور تعارف ہمیں ان ادیبوں کے بارے میں کچھ نہیں لکھنا پڑے گا بجز ڈاکٹر عزیزہ بانو۔ ان کے مضمون میں فیض کے اشتراکی خیالات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہاں شاعر کی انسان۔ دوستی ابھر کر نظر آتی ہے اور استحصالی نظام سے اس کی نفرت بھی۔

ہاں ایک دو باتیں اور لکھنا باقی ہیں: زندگی کا بیشتر حصہ جس طرح گذرا اس میں یہ تصور کرنا ناممکن ہی سا لگتا تھا کہ ایک روز ہمارے قلم کی کاوش ایک کتاب کی شکل اختیار کرلے گی۔ اس مقام پر پہونچانے کا کام ہمارے دوستوں نے کیا، خاص طور پر مرلی منوہر پرساد سنگھ نے۔ جہاں تک نیشنل بک ٹرسٹ کا تعلق ہے، جس کے زیرِ نگرانی یہ کتاب شائع ہوئی، اس نے نصف صدی کے اندر بطور ایک معیاری پبلشنگ ادارے کے اپنی علیحدہ پہچان بنائی ہے۔ ہمیں اس کے اسٹاف سے پورا تعاون ملا اور بہت تھوڑے وقت میں شمس اقبال، اردو سیکشن کے روحِ رواں نے اپنی صلاحیتوں کا پورا مظاہرہ کیا، ہم ان کے اور این۔ بی۔ ٹی کے متعلقہ اسٹاف کے شکر گذار ہیں۔

نیشنل بک ٹرسٹ کے موجودہ چیئرمین پروفیسر بپن چندر ایک نامی گرامی مورخ ہیں۔ وہ ہر اس چیز کو فروغ دینے میں لگ جاتے ہیں جو انسانی اقدار کو توانائی دے۔ بپن صاحب زندگی کو سنوارنے کے لئے کتاب کے رول کو اہم مانتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کی قیادت میں اس پبلشنگ ادارے کی کارکردگی سنورتی گئی۔ موصوف نے اس کتاب کی اشاعت میں پوری طرح دلچسپی لی اور یہ ثابت کردیا کہ فیض کے صد سالہ جشن کے موقع پر این۔ بی۔ ٹی کسی سے پیچھے نہیں ہے۔

زیادہ تر مضامین کا ترجمہ ناچیز نے کیا ہے اور اس کو زیادہ موزوں بنانے کے لئے بیچ بیچ میں مصنف سے بھی رائے لینا مناسب سمجھا۔ اس پروسس (process) میں کچھ جملے حذف ہو گئے ہیں اور کچھ شامل بھی کرلئے گئے ہیں۔ موزوں الفاظ کی تلاش میں کانتی موہن، چنچل چوہان، ڈاکٹر بھگوتی پرشاد، ڈاکٹر جاوید، ریکھا اوستھی و ڈاکٹر سدھیر چوہان کی نیندیں حرام کرتے رہے۔ نشاط سیّدہ نے دو مضامین — غرورِ عشق کا بانکپن، ہندی کی دنیا میں فیض کا ترجمہ کیا ہے۔ کچھ اکنامک ٹرمس (economic terms) یا ایونٹس (events) کے لئے پروفیسر اسِت بینرجی، ڈاکٹر چندر پربھا، ڈاکٹر ٹی۔ ایم۔ تھامس اور ساتھی

مہندر سنگھ کے ہم شکر گزار ہیں۔ پاکستان سے رخسانہ، عذرا، سلمان، احسن، و نیر سیّد نے نہ صرف ہماری حوصلہ افزائی کی بلکہ کئی کتابیں بھی پہونچائیں۔ اس میں ظفر اللہ پوشنی کی "زندگی زنداں دلی کا نام ہے" کا تازہ ترین پانچواں ایڈیشن ہے مع ان کے آٹوگراف کے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری و شعبۂ اردو کی لائبریری کے اسٹاف نے ہمارے ساتھ پورا تعاون کیا، ان سب کے لئے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ خلوص کا متبادل شکریہ نہیں ہوسکتا۔ ہم احسان مند ہیں پروفیسر عرفان حبیب، پروفیسر ارجن دیو اور پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی کے جنہوں نے فیض کے بارے میں جو بتایا۔ لیکن اس مدد، حوصلہ افزائی، کتابوں کی فراہمی کے باوجود ترجمے میں غلطیاں نظر آئیں اس کو قارئین نوٹ کرکے بندے کو ضرور بھیجیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں اس کو درست کرلیا جائے۔

افسوس صد افسوس، کبھی یقین نہیں آتا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے! جب یہ کتاب اپنے اختتامی دور میں تھی تو کمپوزر سمیع اللہ قنوجی اس جہانِ فانی سے 20 جون 2011 کو کوچ کرگئے۔ مرحوم نے بہت محنت سے اس کتاب کی کمپوزنگ کی بچھ اور سانحے ہوئے۔ 9 فروری 2011 اردو کے مصنف اختر جمال نے داغِ مفارقت دیا، اسی دوران ستیندر سنگھ نور، پنجابی کے نامور مصنف اور ہمارے دوست ہر بھگوان مہندی رتا نے جامِ الوداعی پیا۔ بہرحال ان صدمات کے بیچ نشاط سیّدہ، شریکِ حیات، ہمدم بدری رائنا، ڈاکٹر شاسوتی مزمدار و پروفیسر وبھا موریہ کی کرم فرمائی کام آتی رہی اور سب سے زیادہ حوصلہ پرور ثابت ہوئے فیض کے اشعار:

رُت بدل جائے گی
غم نہ کر غم نہ کر

ہاں ہمیں امید ہے بلکہ پورا یقین ہے کہ ایک دن ہندوستان و پاکستان کے عوام دل کے رشتوں کو استوار کرنے میں کامیاب ہوں گے اور ایک ایسی دنیا قائم کریں گے جہاں آنے والے خوش و خرم رہیں گے اور عالم کو دکھادیں گے کہ دوستی کیا ہوتی ہے!

———

دیباچہ: دو چار قدم اور چلو

ڈاکٹر اسلم پرویز

بیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے اردو ادب نے اپنی ایک امتیازی شکل اختیار کر لی تھی، خاص طور پر شعری ادب ایک چمن زار بن گیا تھا اور اس کی صدا ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی تھی۔ لیکن پھر بھی ابھی اور سنورنا تھا، نکھرنا تھا۔ اردو ادب کی خصوصیت رہی ہے کہ اس نے وقت کی نبض کو پہچاننے کی کوشش کی اور اس لئے وہ نئے خیالات سے با بہرہ رہی اور جب قومی تحریک آگے بڑھی تو اس کی گونج بھی سنائی دینے لگی۔ ساتھ ساتھ جب بیسویں صدی میں عالمی پیمانے پر جہاں ایک طرف سامراجی لوٹ چل رہی تھی تو دوسری طرف روس میں ایک بنیادی تبدیلی آئی۔ انقلاب 1917 میں، نہ صرف کامیاب ہوا بلکہ اس کی بھینی بھینی خوشبو چاروں طرف پھیلنے لگی۔ ہندوستان کے دانشوروں اور ادیبوں پر بھی اس کا اثر ہوا۔ ترقی پسند ادب کی صورت میں نمایاں ہونے لگا۔ 10-9 اپریل 1936 میں ترقی پسند تحریک نے انجمن ترقی پسند مصنفین کو جنم دیا۔ ترقی پسند تحریک کے اثرات ادب کی دنیا میں واضح طور پر دیکھے جانے لگے۔ ادب کی قلمرو میں ترقی پسند تحریک کے اثرات یوں تو ہندوستان کی بیشتر زبانوں میں پھیلے لیکن شمالی ہند میں ترقی پسند ادبی تحریک کا ایک بڑا اور مشترکہ محاذ اردو، ہندی اور پنجابی ترقی پسند ادبی تحریک کی شکل میں سامنے آیا۔ اردو زبان کی حیثیت ہندی اور پنجابی کے درمیان

ایک ایسے ہمجولی کی تھی جو ایک طرف اپنی لسانی یکسانیت کے سبب ہندی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چل رہی تھی اور دوسری طرف پنجاب میں بھی تھی جن میں ہر ملت کے شعرا و ادیب تھے۔ یہاں یہ بھی بات قابلِ غور ہے کہ ان کے بیچ کیمونی کیشن گیپ (communication gap) کی وہ صورت نہیں تھی جو عموماً مختلف زبانوں کے دوسرے بولنے اور لکھنے والوں کے درمیان دیکھی جا سکتی تھی۔ چنانچہ ہندی اور پنجابی بولنے والوں تک فیض، کرشن چندر، ساحر لدھیانوی، مخدوم، راجندر سنگھ بیدی، عصمت، منٹو، اوپندر ناتھ اشک کے نام اردو، ہندی اور پنجابی کے حلقوں میں مشترکہ طور پر معروف اور مقبول تھے۔ فیض بالخصوص ان شاعروں میں تھے جو اردو، ہندی اور پنجابی کی ادبی فضا پر پوری طرح چھائے ہوئے تھے۔

فیض ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اور دیکھتے دیکھتے وہ اس کے ایک اہم ستون بن گئے۔ شعری ادب میں جو مقام ان کو حاصل ہوا وہ کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوا اور آج جب ان کی ولادت صد سالہ منائی جا رہی ہے تو ہند کے ادیب بھی، دانشور بھی اس باشعور شاعر کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ لیکن فیض صرف اردو والوں کے نہیں ہندی والوں کے بھی چہیتے شاعر ہیں۔ ان کی وفات کے بعد آج تک ہندی کے اخباروں و رسالوں میں ان کا گن گان کیا جاتا رہا۔ حال میں 'نیا پتھ'، 'آجکل ہندی'، 'انبھے سانچا' کے فیض پر خصوصی جنم شتی نمبر شائع ہوئے ہیں۔ یہ ہندی ادب کے معیاری رسالے ہیں اور ان میں ہندی کے ادیبوں نے کس طرح فیض کو جانا و پہچانا صاف طور پر عیاں ہو جاتا ہے۔ فیض شناسی میں وہ اردو ادیبوں کے ساتھ شانہ بہ شانہ نظر آتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی ابھر کر آتی ہے کہ فیض کی شاعری جتنی اردو میں شائع ہوئی ہے اتنی ہی یا شاید اس سے بھی زیادہ ہندی میں چھپی ہے اور ہندی میں بھی ترجمہ ہو کر نہیں بلکہ صرف رسم الخط کی تبدیلی کے ساتھ جوں کی توں۔ جس کا مطلب ہے کہ فیض کے ہندی کے قاری نے بھی

ان کے کلام کے ساتھ ایک مکمل مکالمہ برقرار رکھا ہے، بنا کسی بھی قسم کے کمیونی کیشن گیپ کے۔فیض بیسویں صدی کے لگ بھگ چار دہائیوں تک اپنی زندگی میں اور بقیہ دو تین دہائیوں سے اپنی موت کے بعد ہندی متوالوں کے ساتھ برابر مکالمہ قائم کیے ہوئے ہیں۔

یہ ایک خوش آئند صورتِ حال ہے جس کا نہ صرف نوٹس لینا چاہیے بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ اُجاگر بھی کرنے کی ضرورت ہے اور اس کا احساس دلانے کی سمت کی طرف جب ہمارے دوست ظہور صدیقی نے قدم بڑھایا تو ہمیں بہت اچھا لگا۔وسعت النظری کا تقاضا ہے کہ ہم ان ہندی کے ادیبوں کا خیر مقدم کریں جو فیض شناسی میں اپنے دل کی گہرائیوں و دماغی شعور کے ساتھ جٹے ہوئے ہیں۔اس کتاب میں جس کی ترتیب ظہور صدیقی کر رہے ہیں، کئی نامی گرامی ادیب نمایاں ہیں۔اصغر وجاہت نے فیض کے بارے میں جو لکھا، جو پڑھا، جو کہا وہ سب اس کتاب میں شامل ہے۔وہ ہندی ادب کے صفِ اوّل کے لیکھک ہیں اور ساتھ ساتھ عہدِ شباب سے فیض کے پرستار بھی۔اس کتاب میں پروفیسر ہربنس کھیا، جو ایک باشعور مورخ ہیں، اپنی گفتگو میں فیض شناسی کے ساتھ اس دور کے کچھ اہم نکتوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔اتھل روزنبرگ کی نظم کا ترجمہ بہت ہی دل آویز ہے۔

چنچل چوہان حالانکہ انگریزی پڑھاتے رہے لیکن ہندی میں لکھتے رہے۔ان کا مضمون، نروان (دربدری) فیض شناسی میں ایک اہم اضافہ ہے۔انہوں نے اپنی انگریزی زبان کی علمیت، ہندی و اردو کی جانکاری کا پورا پورا استعمال کیا ہے۔وہ 'نیا پتھ' کے مدیر ہیں مُرلی منوہر پرساد سنگھ کے ساتھ۔

مُرلی منوہر پرساد سنگھ ہندی ادب میں ایک معتبر نام ہے۔حال میں انہوں نے 1857 پر ہندی میں ایک مستند کتاب ترتیب دی ہے جو ان کے قومی احساسات کی ترجمانی کرتی ہے۔ پھر کانتی موہن کے ساتھ ساحر لدھیانوی کے شعری انتخاب کو کتابی شکل دی اور حال میں 'نیا پتھ' کا ایک یادگار فیض نمبر نکالنے میں کامیاب رہے، سنا ہے کہ کتابی شکل میں فیض پر ان کی تازہ

ترین تخلیق راجکمل پرکاشن والے شائع کر رہے ہیں۔اس کتاب میں بھی ان کا ایک مضمون بہ عنوان 'تنہا کبھی نہیں لوٹی آواز' موجود ہے جو فیض شناسی میں ایک اچھوتا یوگدان ہے۔اس کتاب میں سہیل ہاشمی نے آسان زبان میں مگر پوری لے کے ساتھ اپنا مقالہ 'فیض کے معنی' لکھا ہے۔

ڈاکٹر کانتی موہن شرما جو عام طور سے ادبی حلقوں میں کانتی موہن کے نام سے جانے جاتے ہیں اور اردو ادب کے نہ صرف دلدادہ ہیں بلکہ ہندی رسم الخط میں 'اردو' شاعری بھی کرتے ہیں اور تخلص سوز رکھتے ہیں۔ان کا غزلوں و گیتوں کا مجموعہ 'رات گئے' (2002) کافی مقبول رہا۔'پریم چند اور اچھوت سمسیا' ایک مستند کتاب کی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔اس تھیسس پر یونیورسٹی آف دہلی نے ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی تھی۔'اتر گاتھا' کے خصوصی فیض نمبر (85-1984) کی تشکیل میں ان کا نمایاں رول رہا اور ان کا مضمون 'راول پنڈی کیس' کا ایک اچھا تجزیہ ہے۔

من موہن جو آجکل ایم ڈی یونیورسٹی روہتک میں ہندی شعبے میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں، اُن کا آرٹیکل نہ صرف فیض کی شخصیت پر روشنی ڈالتا ہے بلکہ ان کی شاعری کو ایک اچھوتے انداز میں پیش کرتا ہے: وہ میر و غالب کے کلام سے متاثر لگتے ہیں اور فیض کو ان سے وابستہ کرتے ہوئے ان کی انقلابی کیفیت کو اُجاگر کرتے ہیں۔ارُن کمل کا بھی لکھا ہوا 'ریویو' آج بھی نیا لگتا ہے، رومانیت و انقلابیت کا سنگم۔

اسد زیدی ہندی ادب میں اپنی ایک امتیازی جگہ بنائے ہوئے ہیں اور ان کا ہندی میں لکھا ہوا لیکھ 'اظہارِ عقیدت اور وقت کی کیفیت' غالب کی عظمت سے متاثر تو ہے ہی ساتھ ساتھ وہ فیض کے کلام میں ایسی باتوں کو زیرِ بحث لائے ہیں جو ابھی تک 'فیض شناسی' میں اس بیباکی سے رونما نہیں ہوئیں۔ڈاکٹر ایم اے جاوید نے اقبال پر اپنی کتاب شائع کر کے دانشوروں کے سامنے کچھ اہم سوال اٹھائے ہیں۔حالانکہ دلّی یونیورسٹی کے شعبہ پالیٹیکل سائنس سے

جڑے رہے پھر بھی اردو سے ان کا رشتہ برقرار رہا اور اس کتاب میں اپنے مضمون کے ساتھ نمایاں ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم سے ایک مکالمہ گذشتہ یادوں کو تازہ کرتا ہے اور ہمیں یاد دلاتا ہے کہ انھوں نے فیض کے گذرنے کے بعد ان پر خراجِ عقیدت کے طور پر ایک مستند کتاب فوراً شائع کی جس میں انیک اردو کے نامی گرامی ادیبوں کے مضامین ہیں اور اب اس کا تازہ ترین ایڈیشن سامنے آنے والا ہے۔

یہاں دو اور سپادکوں کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ ایک ہیں آجکل- ہندی کی ایڈیٹر سیما اوجھا جنھوں نے ایک حسین و بلند پایہ کا فیض نمبر نکالا اور انھوں نے ہندی میں فیض پر جو مضمون لکھا ہے وہ ان کے نیک جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ سیما ان دانشوروں میں سے ہیں جو فیض کے پیغامِ انسانیت کو عملی جامہ پہنانے میں دل و جان سے لگی ہوئی ہیں۔

دوارکا پرساد چارُومتر کا 'انبھے سانچا' کا فیض جنم شتی نمبر نہ صرف دیدہ زیب ہے بلکہ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ فیض کے چاہنے والے کیوں آج بھی ہندی ادب میں ان کا چراغ روشن کیے ہوئے ہیں۔ اپنے اداریے میں دوارکا پرساد 'چارومتر' فیض کو اور فیض کے وسیلے سے اردو شاعری کی روشن خیالی کی اس روایت کو بھی جو ابتدا ہی سے مذہبی دھندلکوں کو صاف کرتی ہوئی انسانیت کا پیغام دیتی ہوئی آگے بڑھتی رہی ہے، بجا طور پر سراہا گیا ہے۔

ظہور صدیقی نے گذشتہ دنوں ہندی کے معیاری رسالوں میں فیض کے بارے میں کافی لکھا ہے۔ خاص طور پر فیض کے دور میں اختر جمال و احسن علی خاں 'یران کا لکھا اچھا لگا مگر اس سے زیادہ ان کی یہ کاوش جس میں انھوں نے ہندی ادیبوں کی فیض شناسی کو ایک پیغام کی لے دی ہے۔ وہ ہمیشہ امن کے لیے آواز بلند کرتے رہے اور ان کی یہ دلی آرزو رہی کہ فاصلے مختصر ہوتے چلے جائیں اور پڑوسی ملکوں کے عوام ایک دوسرے سے جڑتے چلے جائیں۔ ایک ایسا خوشگوار ماحول بنے جو سرحد کو بے معنی کر دے۔ خصوصی طور پر پاکستان اور ہندوستان کے عوام و دانش ور اتنے قریب آجائیں کہ پھر کبھی جدا نہ ہوں اور کتنی خوشی کی بات ہے کہ جب پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی مئی 2011 کو لاہور پہنچے تو انھوں نے وہاں کے دانشوروں و ثقافتی فنکاروں میں ایک ولولہ انگیز صحت مند جذبہ رواں دواں دیکھا: پاکستان

کے عوام شدت کے ساتھ رشتوں کو استوار کرنا چاہتے ہیں۔ یونیورسٹی کیمپس میں بھی یہی سماں رہا۔ سنجیدہ گفتگو کے بیچ فیض کو یاد کیا گیا اور اس بات پر اصرار تھا کہ کیوں نہیں دونوں طرف سے الفت کا کاروان ایسا چلے کہ پھر اس کی رفتار کبھی سست نہ ہو۔ نہ صرف بادِ نسیم 'یادوں' سے معطر رہے بلکہ متور بھی! فیض نے انسانیت اور انسان دوستی' لسانی اور تہذیبی ہم آہنگی کی جو ایک فضا اپنے کمالِ فن سے بنائی ہے کیوں نہ ہم اپنی کوششوں سے اس کا دائرہ وسیع کرتے چلیں۔

ابتدائیہ: کچھ الفاظ کچھ احساسات

ظہور صدیقی

ایک حساس دل میں جذبات جب مچلتے ہیں تو کچھ نوجوانوں کی زبان پر یہ شعر کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک آدھ شعر پر گاڑی نہیں رُکتی تو پھر یہ شاعر کہلانے لگتے ہیں۔ فیض کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہوگا لیکن ایک بار جب اس منزل پر قدم رکھا تو یوں ہی ہو کر نہیں رہ گئے۔ موجِ خرام یار گُل کترتی چلی گئی۔ ابتدائی جوانی رومانیت کا آنچل لہرانے لگی۔ عجیب عالم ہوگا جب اُن کے شعر الفاظ کے حسین پیکر میں ڈھل کر نوجوانوں کے دلوں پر آری چلا رہے ہوں گے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر طرف نوجوانوں کے ٹولے کے ٹولے ان کے پروانے بنتے چلے گئے۔ ایک عجیب سا رشتہ استوار ہوتا گیا جس نے ایک ابدی شکل اختیار کر لی۔ بھلے ہی وقت کی کروٹوں کے ساتھ ساتھ فیض کی شاعری میں بنیادی تبدیلی آ گئی تھی لیکن چاہنے والوں کا، ان کے پرستاروں کا یہ جمِ غفیر ہر موڑ پر ان کے ساتھ نظر آیا۔ وہ ہی نہیں ہر عمر کے لوگ اس کاروانِ حیات میں شامل ہوتے گئے۔

اس ابتدائی دور کی کہانی اردو ادب کے کئی ممتاز ادیبوں کے قلم کی زد سے بچی نہیں رہی مگر ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنے اچھوتے انداز میں اس طرح اس کی رونمائی کی ہے:

''فیض ہماری محفلِ شعر میں 'اعترافِ شکست' اور 'ارتکابِ گناہ' کی رومانی

معذرت' کے ساتھ داخل ہوا ہے۔ اس دور میں ان کی تمام تر متاع 'کھوئی ہوئی یاد'، 'انتظارِ بے انداز' 'دکھتا ہوا دل' 'فریاد کے ٹکڑوں' مجبور جوانی کے داغدار ملبوس پر مشتمل تھی۔ یہ عنوان شباب کی شاعری تھی لیکن اس میں بھی لذت کے بجائے ایک تقدس ہے۔''

(فن اور شخصیت 91)

فیض اپنی اس ابتدائی شاعری کے بارے میں 'نقشِ فریادی' میں یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں:

''پہلے حصے میں طالبِ علمی کے زمانے کی نظمیں ہیں، انھیں حذف نہ کرنے کی نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ ان نظموں میں جس کیفیت کی ترجمانی کی گئی ہے وہ اپنی سطحیت کے باوجود عالمگیر ہے۔ ایک خاص عمر میں ہر کوئی یہی کچھ محسوس کرتا ہے اور اسی انداز سے سوچتا ہے لیکن عام طور سے ان تجربات کا خلوص تمام عمر قائم نہیں رہتا کچھ عرصے کے بعد انسان اپنی ذات کو مرکزِ دو عالم سمجھنا چھوڑ دیتا ہے اور اسے عالمگیر ظلم اور بے انصافی کے پیشِ نظر اپنی ذرا ذرا سی ناکامیاں بے حقیقت دکھائی دینے لگتی ہیں۔''

احتشام حسین نے فیض کی نظم 'یاد' کا موازنہ ایک دوسری نظم جوان کے ذہن میں محفوظ ہو کر رہ گئی تھی، سے کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شاید یہ ہر محبت کرنے والے کی داستان ہے۔'' (فن اور شخصیت 310)

فیض نے اس نظم میں جس طرح الفاظ کو پرویا ہے وہ رومانیت کے شاہکار ہیں، ان کا اپنا مزاج ہے، اپنی لے ہے۔ پھر وہ کہیں لڑکھڑاتے نہیں بلکہ ایک معیاری شکل اختیار کر لیتے ہیں اور یہ 'معیار' بھاری نہیں لگتا بلکہ بادِ صبا بن جاتا ہے۔ احتشام حسین نے صحیح لکھا ہے:

''فیض کا ذاتی تجربہ محبت کا آفاقی تجربہ ہے۔ اور نجی ہونے کے باوجود وسیع معنی اشعاروں میں بیان ہوا ہے۔ اس لیے اظہار کی انفرادیت میں بھی جامعیت اور آفاقیت ہے۔'' (وہی 311)

اسی طرح ذرا اس مصرعہ پر بھی نظر ڈالیے 'یاد باقی ہے بے کسی کی دلیل' حصول سے محرومی کو جس سُبک انداز میں فیض نے بیان کیا ہے اس میں پژمردگی نمایاں ہے مگر ہارڈی کے جملوں کی طرح اُن کے رومانی مصرعے و اشعار فنکارانہ ادبی صلاحیتوں کا نمونہ بھی بن جاتے ہیں اور دل کو تڑپانے والی جھنکار بھی۔ پھر ان اشعار پر فدا ہوئے بغیر آپ نہیں رہ سکتے:

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

اور پھر کس سادگی سے فیض کہہ جاتے ہیں:

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہارِ شباب
آ، کہ کچھ دل کی سُن سُنالیں ہم
آ، محبت کے گیت گالیں ہم

نظم 'انتظار' کے یہ مصرعے زیرِ نظر لائیں:

بہارِ حسن پہ پابندیٔ جفا کب تک؟
یہ آزمائشِ صبرِ گریز پا کب تک؟
قسم تمہاری! بہت غم اٹھا چکا ہوں میں
غلط تھا دعویٔ صبر و شکیب، آجاؤ
قرارِ خاطرِ بے تاب، تھک گیا ہوں میں

پھر 'میرے ندیم' کو ملاحظہ کریں:

خیال و شعر کی دنیا میں جان تھی جن سے
فضائے فکر و عمل ارغوان تھی جن سے
وہ جن کے نور سے شاداب تھے مہ و انجم
جنونِ عشق کی ہمت جوان تھی جن سے
وہ آرزوئیں کہاں سو گئی ہیں میرے ندیم!

یہ سب کچھ فیض نے اس وقت کہا جب ان کا شعورِ عشق بتاں کی زلفوں کا اسیر تھا، ''جنونِ عشق کی ہمت جوان تھی'' اور 'آ، محبت کے گیت گالیں ہم' کا نغمہ ان کے ہونٹوں پر رقصاں تھا۔ رومانیت ایک فطری جذبہ کے تحت تھی لیکن اندازِ بیان میں وہ ایک تپے ہوئے شاعر لگتے ہیں۔ ایسی بنیاد پر جب غمِ دوراں کی عمارت کھڑی ہوئی تو وہ پائیدار رہی۔ فن صناعی اپنے ایک لافانی معیار پر پہنچ جاتا ہے اور 'خیال و شعر' کی دنیا غمِ دوراں کی بھٹی میں کندن بن جاتی ہے۔

ہاں یہاں اس بات پر بھی غور کریں کہ ان کا طرزِ اسلوب قائم رہا۔ محبوب کے خدوخال و چال ڈھال سے بخشی ہوئی صناعی ان کے ساتھ رہتی ہے۔ سماجی تصورات ابھرتے ہیں، ان کے ذہن میں بیداری کی نئی لہریں اٹھتی ہیں، اور ان کے قدم ایک نئی دنیا کی طرف گامزن ہوتے ہیں مگر فیض کبھی بھی رومانیت کو ان کی ضد نہیں سمجھتے بلکہ اس کے جمال سے اپنے انقلابی رجحانوں کا سنگھار کرتے رہتے ہیں: 'تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم'۔

فیض کی شاعری کا دوسرا دور اپنے طرزِ اسلوب کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے جذبۂ صداقت کی وجہ سے نکھر کر سامنے آتا ہے۔ لفظوں کو خوبصورتی سے تراشتے رہے لیکن معنی بدل گئے مگر ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ فیض عوامی شاعری کے نقیب ضرور ہوئے مگر ان کی شخصیت کی سادگی برقرار رہتی ہے۔ وہ ہانکنے کے قائل کبھی نہیں رہے۔ انہوں نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ پیدائشی انقلابی تھے بلکہ آہستہ آہستہ وہ آگے بڑھتے ہیں۔ جو فیض کی زندگی کا مقصد ٹھہرا وہ عمر کا ایک حصہ بتانے کے بعد ان کے شعور کا ایک اٹوٹ حصہ بنا۔ ہاں یہ ضرور تھا

کہ روس کے 1917 کے سماجی انقلاب کی باتیں بچپن میں ان کے کانوں میں پڑتی رہیں مگر یہ آوازیں کسی دانشور کی نہیں تھیں اور نہ کسی معلمِ کی بلکہ ان کے محلّے کے عام لوگوں کی ,جو سیالکوٹ کے شہری تھے۔

اس سلسلے میں فیض کے ہی لکھے ہوئے مقالے پر نظر ڈالیے۔ یہ پہلی نظر میں محبت کا معاملہ نہیں تھا۔ کئی منزلیں طے کرنے کے بعد وہ انقلاب کے عاشق ہوئے، اس کے ستون بنے۔ انقلاب کے بارے میں بچپن میں جوانہوں نے اپنے گھر کے بیرونی چبوترے پر'' آ جمع اللہ دیا پہلوان، چراغ دین تیلی، اللہ رکھا قصاب، خوشیا حجام اور ان کے یار دوست گھنٹوں ملکی اور غیر ملکی سیاست پر گپ لڑاتے رہے۔'' سے سُنا اس کو فیض نے اپنے مقالے 'سوویت یونین کا پہلا تصور' میں اس طرح بیان کیا ہے:

> '' وہاں کوئی لیڈر پیدا ہوا ہے' لینن، اس نے مزدوروں کی فوج بنائی ہے اور بادشاہ کو بھگا کر سب روپیہ پیسہ لوگوں میں بانٹ دیا ہے۔'' اور مزدوروں کا راج بھی بنا دیا ہے۔ 'شاباش شیر دے پتر (شیر کے بیٹے)
> '' کوئی ایسی ترکیب لڑ جائے تو مزہ آجائے، یہ سامنے والے ساہوکار لالہ ہر جس رائے کا مال بٹے تو ہم سب کے وارے کے نیارے ہو جائیں۔''
>
> (مطالعہ فیض یورپ میں 316)

ایک 7-6 سال کے لڑکے نے جو سُنا بغیر کسی بناوٹ کے ایک مدّت گذرنے کے بعد سادگی سے لکھ دیا۔

پوسٹ گریجویٹ کورس میں داخلہ ملنے کے بعد بھی فیض سوویت یونین کے نام سے 'پوری طرح آشنا نہیں' ہوئے تھے۔ لیکن ایم۔ اے انگریزی کے نصاب کی وجہ سے ان کو اٹھارویں و انیسویں صدی کے ادب کا مطالعہ ضرور کرنا پڑا۔ وہ اِدھر اُدھر کی کتابیں پڑھتے رہے اور یوں

روس کے کلاسیکی ادب سے تعارف ہوا۔ چنانچہ گوگل، پشکن، دوستوفسکی، ترگنیف، ٹالسٹائے، چیخوف، باری باری سے سب کو بہت ڈوب کر پڑھا اور'' پرانے روس کی دنیا نظر میں گھوم گئی۔ بے زبان اور بے کس کسان، عیاش اور خود پسند امراء، دل پھینک نوجوان اور عاشق مزاج محبوبائیں، قلاش انقلابی نوجوان اور اونچی دانشور، بے نور لکڑی کے گھروندے اور جگمگاتے ہوئے محلات، گھنے جنگل اور لق و دق میدان، صحرا اور دریا، جنگیں، معاشقے، سازشیں...... ظلم اور اس کا توڑ؟ جبر اور جذبہ بغاوت، اداسی اور رنگینی اور بدی، ذلت اور شرافت، فلم کے پردے کے مانند، طرح طرح کے مناظر نظر سے گذرنے لگے۔ ان لوگوں کا حکمران طبقہ دنیا و ما فیہا سے غافل اپنی معین تباہی کی جانب کھنچا چلا جا رہا تھا۔'' (وہی 318-317)

اسی مضمون میں فیض نے چٹا گانگ، کاکوری، بھگت سنگھ، آزاد، شیر جنگ کے بارے میں یہ بتایا ہے کہ ان کا 'گھر گھر یہی تذکرہ تھا' اس 'دہشت گرد تحریک' کا شروع شروع میں کوئی واضح اثر فیض کے دماغ پر نظر نہیں آتا اس کے باوجود کہ ان کے دو تین قریبی دوست' بھی تیز گام تھے۔ ان کے سرغنہ خواجہ خورشید انور تھے، جن کا تذکرہ بی بی گل نے اختر جمال سے بھی کیا تھا۔ مختصراً فیض کے ان دوستوں نے ان کے کمرے کو اپنے خفیہ لٹریچر بانٹنے کا اڈہ بنا رکھا تھا۔ یہ تحریریں بیشتر کارل مارکس، لینن اور انقلاب روس سے متعلق تھیں اور کبھی کبھار سرسری نظر سے فیض بھی دیکھ لیا کرتے تھے۔''

کچھ اور واقعات رونما ہوئے جیسے 'شیخ عبداللہ کی مہاراجہ کے خلاف بغاوت کا اعلان اور جب تحریک اور گرم ہوئی تو حالانکہ ان کے 'بچپن کے نقوش دوبارہ ابھر آئے' لیکن ابھی کلاسیکی دنیا ہی ان کے ذہن پر حاوی رہی مگر 1929 کا معاشی بحران یعنی گریٹ ڈپریشن (عظیم کساد بازاری) نے ان کو حقیقی دنیا کے حالات سے منسلک کر دیا۔ فیض پہلے ادیب ہیں جنہوں نے کساد بازاری کو نہ صرف سمجھا بلکہ اس پر کچھ لکھا بھی۔ دراصل عالمی کساد بازاری کا اثر ان کے ذہن پر ایسا پڑا کہ ان کو لگنے لگا کہ جس معاشی معاشرے کے تحت ان کے ملک کا نظام چل رہا

ہے وہ بنیادی طور پر ایک ناقص نظام ہے جہاں عوام کو سکون میسر نہیں ہوسکتا۔ سب سے پہلے فیض نے 'دستِ تہِ سنگ' میں اپنے ابتدائیہ میں، جس کا عنوان رکھا گیا تھا 'فیض از فیض'، کساد بازاری پر چند جملے لکھے:

''پھر دیس پر عالمی کساد بازاری کے سائے ڈھلنے شروع ہوئے۔ کالج کے بڑے بڑے تیس مار خاں تلاش معاش میں گلیوں کی خاک پھانکنے لگے۔ یہ وہ دن تھے جب یکا یک بچوں کی ہنسی بُجھ گئی۔ اجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوریاں کرنے لگے اور اچھی خاصی شریف بہو بیٹیاں بازار میں آ بیٹھیں۔''

(کلیاتِ فیض، نسخہ ئے وفا 308)

اسی بات کو زیادہ تفصیل کے ساتھ فیض اپنے مقالے 'سوویت یونین کا پہلا تصور' میں لکھتے ہیں:

''اب ہم تعلیم ختم کر کے روزگار کی تلاش میں تھے۔ یہ عالمی کساد بازاری اور اقتصادی بحران کا زمانہ تھا۔ غلّہ کوڑیوں کے بھاؤ بکنے لگا تھا اور بھوکے کسان دو وقت کی روٹی کی خاطر دھرتی ماتا سے ناطہ توڑ کر شہروں میں در بدر ہو رہے تھے۔ بے روزگاری کا انت نہ تھا اور ملازمت کا نشان مفقود۔ شریف رذیل ہو رہے تھے اور عزّت دار گھروں کی بہو بیٹیاں بازار میں آ بیٹھی تھیں۔ صرف سرمایہ دار اور ساہوکاروں کی چاندی تھی جو دونوں ہاتھوں سے حاجت مندوں کے اثاثے کے ساتھ ساتھ ان کی عزت اور غیرت بھی سمیٹ رہے تھے۔ جہاں تک مجھے علم ہے برِ صغیر کی سیاحت پر اس بحران کے اثرات کا تفصیلی مطالعہ ابھی نہیں ہوا ہے۔ اس مطالعے سے بہت سی سیاسی

تحریکوں کے ابتدائی محرکات اور عوامل پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ اس بحران سے پہلے بدیسی سامراج اور قومی آزادی کا مسئلہ تو سب کی نظر میں تھا ہی، اب نئے حالات نے قومی دولت کی تقسیم، امیری اور غریبی، مزدور اور سرمایہ دار، کسان اور زمیندار، بندگی اور خواجگی غرض کہ جملہ معاشی اور معاشرتی مسائل کا پہاڑ بھی سامنے لا کھڑا کیا اور ذی شعور لوگ اسے سَر کرنے کی فکر میں سر کھپانے لگے۔ کسان سبھائیں بنیں، مزدور تحریک نے زور پکڑا، اور قومی آزادی کے ساتھ ساتھ سوشلزم اور سماجی عدل و مساوات کے تقاضے بھی عام ہونے لگے۔''

(مطالعہ فیض یورپ میں 319)

سامراجیت سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ عالمی سطح پر اس کے معاشی نظام کی ایسی دُرگت بن سکتی تھی، بھلے ہی پہلی عالمی جنگ عظیم نے سرمایہ دار ممالک کے آپسی رشتوں کو بے نقاب کر دیا تھا۔ ان جنگجو بھیڑیوں کی موجودہ جارحانہ کارروائیوں کی وجہ سے اس کے بلند بانگ تمدنی نعروں کی قلعی بالکل کُھل گئی تھی مگر پھر بھی وہ اندرونی طور پر اپنے معاشی نظام کو فل پروف سمجھتی تھی۔ انہیں دنوں معاشی ترقی نے ان سرمایہ داری ممالک کے بیچ ایک نیا رقیب کھڑا کر دیا، جو معاشی طور پر سرمایہ داری کے ایک مضبوط قلعے کے بطور نمایاں ہوا۔ یو ایس اے (U.S.A.) اس دور میں سرمایہ داری کے میدان میں ابھرتا ہوا ایک سب سے تگڑا معاشی پہلوان تھا۔ لیکن 1929 میں ماہ اکتوبر میں کساد بازاری نے اس کو ہلا کر رکھ دیا۔ 'بادۂ شبانہ کی سرمستیاں ہَرن ہو گئیں۔ شیئر پٹتے چلے گئے، نتیجتاً شیئر مارکٹ کی حالت غیر ہو گئی۔ یو ایس اے شیئر مارکٹ میں شیئر کی بہتات تھی مگر اوندھے پڑے شیئروں کا کوئی پُرسانِ حال نہیں تھا۔ 'متاع' جب بازار میں جاتی ہے تو خریدار کی نظر اس کی طرف مڑ جاتی ہے۔ متاع اور خریدار سے سودا طے ہوتا ہے اور اس طرح مارکٹ چلتی ہے لیکن یہ معاشی کساد بازاری کا جھٹکا اتنا شدید تھا کہ ڈوبتے ہوئے بازار کا کوئی

ملاح نہیں تھا۔

'دنیا کی مکمل تواریخ' Complete History of the World, 2007 میں یہ دعویٰ کیا کہ یو ایس اے "1900 آتے آتے دنیا کی سب سے زیادہ پیداواری معیشت بن گیا"۔ (242) لیکن 1929 کو اس معیشت کو جب مُنہ کی کھانی پڑی تو آرتھر سالٹر کو سرمایہ داری نظام کے نقائص نظر آنے لگے۔ ماڈرن تواریخ میں 1929 کو 'خراب ترین گراوٹ' کا درجہ دیا جانے لگا۔ (وہی 290) جہاں ایک طرف سماجوادی روس اس عالمی کساد بازاری سے محفوظ رہا وہاں یو ایس اے پر یہ ایک معاشی قیامت کا نزول ثابت ہوا۔

"ہزاروں امریکن دیوالیہ ہو گئے، لاکھوں بیروزگار اور بدحال ترقی یافتہ دنیا میں صرف 23 ملین (ایک ملین : دس لاکھ) سے زیادہ بے روزگار ہو گئے۔" (وہی 290)

جب سرمایہ داری نظام کے پیرِ مغاں ہی اپنے میخانے میں لُوھک گئے تو یورپ کے معاشی طور پر ترقی یافتہ کہے جانے والے ممالک بھی اپنی سینہ کوبی کرنے لگے۔ جرمنی میں بیروزگاری بڑھنے لگی تو حکم بادشاہ کا برطانیہ کی معیشت کو سنبھالنے میں بے اثر تھا۔ یو کے (U.K) میں رجسٹرڈ شدہ بے روزگاروں کی تعداد 1928 میں 1.217 (ہزاروں میں) تھی لیکن 1932 میں یہ تعداد 2.745 ہو گئی یعنی دُگنی سے زیادہ۔

برطانیہ کے شاہی جاہ و جلال کے نتیجے ہی یہ معاشی بحران اثر انداز نہیں ہوا بلکہ اس کی لپیٹ میں پسماندہ ممالک بھی آ گئے۔ غلامانہ معاشی بندشوں سے بندھا ہوا ہندوستان کیسے اس سے بچ کر رہ سکتا۔ فیض سب آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور دل و دماغ پر اس معاشی تباہی کا ان پر دیرپا اثر رہا۔

ایک ادبی مقالہ کو ایک مکمل معاشی دستاویز بنا دینا ہمارا منشا نہیں ہے مگر اس عالمی کساد بازاری کا ہندوستان پر جو اذیت ناک اثر پڑا وہ برٹش سرکار کی خود غرض سامراجی عصبیت کا

بدترین نمونہ ہے۔ یو کے (برطانیہ) کی پہلی جنگ عظیم کی معیشت ہندوستان پر ٹکی ہوئی تھی مگر جب 1929 کا بحران شروع ہوا تو پوری شدت کے ساتھ اپنے نقصانات کی تلافی کرنے کے لیے ہندوستان کو چُنا گیا۔ سامراجی شکنجہ کو جتنا بھی کسا جا سکتا تھا اس کو کسا گیا۔ عجیب عالم تھا 1929 کے آخر سے اکتوبر 1931 تک ہندوستان میں قیمتیں 36% لُوھک گئیں جب کہ یو کے میں یہ شرح 27% تھی۔ کے اے مانی کمار نے لکھا ہے: 'جب کہ یہ پالیسیاں برطانیہ کی معیشت کو تحفظ دے رہی تھیں پر ہندوستان کو برباد کر دیا۔" (19) ریل کی آمدنی گرنے لگی اور چاروں طرف غربت کے بادل چھا گئے۔

فیض کی شاعری پر اس کا اثر ہوا۔ فیض 'دستِ تہِ سنگ' میں لکھتے ہیں:

"یکا یک یوں محسوس ہونے لگا کہ دل و دماغ پر سبھی راستے بند ہو گئے اور اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ اس کیفیت کا اختتام جو نقشِ فریادی کے پہلے حصے کی آخری نظموں کی کیفیت ہے ایک نسبتاً غیر معروف نظم پر ہوتا ہے، جسے میں نے 'یاس' کا نام دیا تھا۔"

(ایضاً 308)

نظم 'یاس' کے اختتامی مصرعے دیکھیے:

بُجھ گئی شمعِ آرزوئے جمیل
یاد باقی ہے بے کسی کی دلیل
انتظارِ فضول رہنے دے
رازِ الفت نبھانے والے
بارِ غم سے کراہنے والے
کاوشِ بے حصول رہنے دو

فیض کے سامنے جو واقعات رونما ہو رہے تھے اور جس طرح سے قومی تحریک اپنے مختلف

زاویوں سے جاگتی ہوئی عوام کو آگے بڑھنے پر مجبور کر رہی تھی اس سے وہ بچ نہیں سکتے تھے۔
ایک نوجوان بھگت سنگھ نے اسمبلی میں بم پھینک کر صرف سیاسی لوگوں کو متاثر نہیں کیا بلکہ فیض جیسے طالب علموں کے شعور کو اینٹی سامراجی بنانے میں چنگاری کا کام کیا۔ پھر اُدھر راوی کے کنارے پر پنڈت نہرو نے مکمل آزادی کا نعرہ بلند کیا۔ یہ ایک نئی دنیا تھی، ہندوستان جاگ رہا تھا اور اس جاگرتی نے فیض کے ذہنی شعور کو ایک نئی وسعت دی مگر ابھی تک ان کے ذہن میں انقلاب کا مفہوم مبہم ہی تھا۔ یہاں یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ فیض حساس ضرور تھے مگر چھان بین واچھے مطالعے کے بغیر وہ کسی ایسی بات کو اپنے عملی میدان کے لیے خضرِ راہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے جب تک کہ وہ خود مطمئن نہ ہو جائیں۔ فیض کا وسیع مطالعہ اور ٹھوس ثبوت کے ساتھ واقعات کی پکڑ ان کی شاعری کو معیاری بنانے کے لیے آہنی ستون بنے۔

1934 میں طالب علمی سے فارغ ہونے کے بعد ان کے سامنے روزگار کا سوال تھا۔ لیکن اس وقت ان کا عمیق مطالعہ ان کے کام آیا اور ایسے دور میں جہاں روزگار کے دروازے نوجوانوں کے لیے تقریباً بند ہو گئے تھے ان کو اتنے پاپڑ نہیں بیلنے پڑے۔ ایم اے او کالج امرت سر میں 1935 میں لیکچررشپ مل گئی اور نہ صرف نوکری کا آغاز ہوا بلکہ ایسی صحبتِ یاراں ملی جس نے ان کی زندگی کا رُخ سماجیت کی طرف موڑ دیا۔ ڈاکٹر رشید جہاں اور ان کے شوہر محمود الظفر فیض کو تلقین کرتے کہ بھئی عشق وشق چھوڑو اور دنیا کے دُکھوں کو دیکھو، ذاتی دُکھ بہت حقیر نظر آئیں گے۔ یہی نہیں ایک روز رشید جہاں نے کمیونسٹ مینی فیسٹو (Communist Manifesto) ان کو تھما دی۔ بقول مالک رام: 'لوہا گرم تھا، اس پر میاں بیوی کی تلقین کا ہتھوڑا پڑا، دراصل کمیونسٹ مینی فیسٹو ایک ایسا کتابچہ ہے جہاں ایک طرف اس کے حقائق ہیں تو دوسری طرف اس کا اسلوب بیان اتنا دلفریب ہے کہ اس کا پیغام دل کو چھوتا چلا جاتا ہے۔ برٹرانڈ رسل نے لکھا ہے کہ اگر مارکس کچھ اور نہیں لکھتے صرف کمیونسٹ مینی فیسٹو چھوڑ جاتے تو ان کا نام تواریخ میں زندہ رکھنے کے لیے یہ کتابچہ کافی تھا۔ ظاہر ہے کہ فیض نے

جب اس کا مطالعہ کیا تو ان کے دماغ میں ایک نیا چراغ جل اٹھا۔ اب وہ ایک نئی حقیقت سے دوچار تھے۔ سرمایہ داری کیا ہے؟ اور سامراجیت کیا بلا ہے؟ اب انہیں اس کا معقول جواب مل گیا تھا۔ ان کی سمجھ انہیں آفاقیت کی طرف لے جا رہی تھی، ہر جگہ استحصال، لوٹ کھسوٹ، نت نئے ڈھنگ کے مظالم سب ان کی آفاقی نظریے میں سما رہے تھے مگر یہاں وطن پرستی بھی ان کے ایمان کا جز تھی۔ فیض لکھتے ہیں:

"اسی زمانے میں اہرن برگ نے اپنی کسی تحریر میں ایک جملہ لکھا تھا جو اب تک دل پر کندہ ہے وہ کچھ یوں تھا کہ میاں بیوی آپس میں ناتے توڑ سکتے ہیں۔ محبتیں چھوٹ سکتی ہیں اور عاشق و محبوب جدا ہو سکتے ہیں لیکن ایک رشتہ جو کسی صورت نہیں ٹوٹ سکتا ماں بیٹے کا رشتہ ہے اور ہمارا وطن ہماری ماں ہے۔" (مطالعہ فیض یورپ میں 'سوویت یونین کا پہلا تصور' 327)۔
حیرت ہوتی ہے کہ جس شخص کے ذہن پر وطن پرستی اس حد تک عیاں ہو لیکن جب وہ 1951 میں گرفتار کیا جاتا ہے تو اس کو غدار کہا گیا۔ لیکن آج وہی لاہور' وہی ملک نادم بھی ہے اور شرمندہ بھی۔ پاکستان کا ہر باشعور شہری فیض کو اپنی عظمت کا نشان سمجھتا ہے۔

دراصل فیض پاکستان کے دُکھی معاشرے کی ہی نہیں بلکہ تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک کی آواز بن گئے اور آج بھی ہر جگہ یہ آواز گونج رہی ہے۔

ہندوستان کی تقسیم کے بعد فیض پاکستان کے شہری بنے لیکن عمر گذشتہ میں جو انہوں نے دیکھا اور سمجھا اس تہذیب و تمدن کے وہ ہمیشہ دلدادہ تھے اور گلشن میں طرح طرح کے پھول دیکھ کر وہ ہمیشہ شاداب رہے، سرشار رہے۔

میجر اسحاق 'رودادِ قفس' میں بتاتے ہیں:

"فیض صاحب پاکستان میں بعض اصحاب کے اس نظریے پر بہت رنجیدہ خاطر ہوا کرتے تھے کہ ہر وہ چیز جس کا تعلق ہندوستان سے بھی ہے پاکستان کے لیے زہر ہلاہل ہے...... کسی جاہل نے بزعمِ خود قومی

جوش میں آ کر امیر خسرو، تان سین، واجد علی شاہ، عبدالکریم خاں، فیاض
خاں اور دوسرے بیسیوں اساتذہ اور زُعماسے پاکستان کا رشتہ توڑنے کو
عین حُب الوطنی سمجھ لیا تھا۔"

(کلیاتِ فیض، نسخائے وفا 226)

میجر اسحاق ایک پروفیشنل ادیب نہیں تھے لیکن 'روداد قفس' میں جس طرح کلچر پر جم کر انہوں نے جملے لکھے ہیں وہ قابل ستائش ہیں اس وقت کے لیے بھی جب یہ لکھے گئے تھے اور آنے والے کل کے لیے بھی۔ کیا خوب لکھا ہے:

"ایک خطۂ زمین کے کلچر، زبان، ادب آرٹ، موسیقی، فنِ تعمیر اور
دوسری ثقافتی قدروں کا قوام سیکڑوں، ہزاروں سالوں کی ریاضت کے
بعد تیار ہوتا ہے اور اس کی بنیادی ترکیب میں تبدیلی آسان نہیں ہوتی۔
پاکستان اور ہندوستان میں سیاسی دھینگا مشتی کیسی بھی صورت اختیار کر
جائے، دلّی، لکھنؤ، حیدر آباد اور لاہور کی گنگا جمنی تہذیب اپنی جگہ قائم
رہیں گی۔" (وہی 226)

آگے چل کر میجر اسحاق لکھتے ہیں:

"دوسرے کی ضد میں جڑوں کو نقصان پہنچانا یا شاخوں کی نوچ کھسوٹ
کرنا اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنا ہے۔" (وہی 227)

میجر اسحاق اس 'عنوان' کو ان شبدوں کے ساتھ ختم کرتے ہیں:

"فیض صاحب اُن انسانیت نواز روایات سے تعلق رکھتے ہیں جو
ہزاروں سالوں سے دونوں ملکوں کی سرزمین کا خاصہ رہی ہیں۔ وہ اسی
سلسلے کی کڑی ہیں، جیسے امیر خسرو، بھگت کبیر، خواجہ معین الدین چشتی،
بابا نانک، بابا فرید، ابو الفضل، فیضی، بلھے شاہ، وارث شاہ، شاہ عبد
اللطیف بھٹائی، رحمان بابا اور دوسرے بہت سے بزرگوں نے فیض

بخشا ہے۔" (وہی 227)

مئی 1967 میں سوویت ادیبوں کی چوتھی کانگریس میں ہندوستان کی طرف سے کرشن چندر اور پاکستان کی طرف سے فیض احمد فیض کو بطور مہمان مدعو کیا گیا تھا۔ ماسکو کے ہوٹل مسکوا میں دونوں کو ٹھہرایا گیا تھا اور شام کو ہوٹل مسکوا کے وسیع ڈائننگ ہال میں دونوں کی میزیں اپنے اپنے ملک کے جھنڈے کے ساتھ سجی ہوئی تھیں۔ کرشن چند پہلے پہنچ چکے تھے اور جب فیض پہنچے اور یکا یک دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں فیض خود کو روک نہیں پائے۔ وہ فوراً اپنی کُرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور کرشن چندر نے بھی اپنی کُرسی چھوڑ دی۔ باقی کرشن چندر کی زبانی سنئے:

"پھر ہوا یہ کہ میں اپنی میز سے ہندوستان کا فلیگ لیے اٹھا اور فیض اپنے
میز سے پاکستان کا فلیگ لیے اٹھے اور ہم دونوں ایک دوسرے کی
طرف بڑھتے ہوئے میزیں پار کرتے ہوئے بیچ کی کسی میز پر آ کر رُک
گئے۔ اس پر ہم دونوں نے ہندوستان اور پاکستان کا جھنڈا ساتھ ساتھ
لہرا دیا اور ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔

"سارا ہال تالی پیٹنے لگا۔

"یہ تالی اس وقت تک بجتی رہی جب تک فیض اور اس کی ترجمان، میں
اور سلمٰی اور ہماری ترجمان ایرینا اس میز کے چاروں طرف بیٹھ گئے۔
کیا سمجھتے ہیں یہ لوگ؟ ہم لوگ بھی کیا متعصب سیاست دانوں کی طرح
ایک دوسرے کے دشمن ہیں؟ ادب میں یہ دشمنی نہیں چلتی اور کاش کہیں
بھی نہ چلے۔

اس کے بعد جتنے دن ہم ہوٹل مسکوا میں رہے، میری اور فیض کی میز ایک ہی رہی۔ ہندوستان اور پاکستان ایک ہی میز پر کھاتے رہے۔"

(مطالعۂ فیض یورپ میں 52-351)

فیض جب ایک صحافی کے طور پر لکھتے تھے تو ہو سکتا ہے کچھ کو ایک آدھ بات پسند نہیں آئے۔

لیکن جب ان کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو وہ امن کے پجاری لگتے ہیں اور جب وہ ہندوستان کی طرف دیکھتے تو وہ ان کو رادھا لگنے لگتی۔ اور جب بھی ان کو موقع ملتا وہ خوشی خوشی یہاں آکر رَم جاتے۔

تقسیم ہند کے از حد دردناک پہلو بھی تھے لیکن ترقی پسند تحریک نے ایک حوصلہ دیا۔

ترقی پسند تحریک اس دور کا نتیجہ ہے جو دانشوروں کو جھنجھوڑ رہا تھا، ان کو عوام کے پاس جانے کے لیے مجبور کر رہا تھا۔ سجاد ظہیر، ڈاکٹر اشرف اور ان کے باشعور ساتھیوں نے اس بدلتے ہوئے دور کی نبض پر صحیح وقت میں انگلیاں رکھ دیں۔ پریم چند کی صدارت میں یہ کانفرنس 9 اپریل 1936 کو شروع ہوئی اور دوسرے دن کے اختتامی اجلاس میں ترقی پسند تحریک کی تنظیمی بنیاد پڑی اور اس کا نام انجمن ترقی پسند مصنفین ہند رکھا گیا تھا۔ 1936 میں اس کے 'اعلان نامہ' میں اس ادبی تحریک کا مقصد صاف عیاں ہو جاتا ہے:

"ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادبیات اور فنونِ لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مُہلک گرفت سے نجات دلائے اور ان کو عوام کے سکھ دکھ اور جدو جہد کا ترجمان بنا کر اس روشن مستقبل کی راہ دکھائے کہ جس کے لیے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے۔

ہم ہندوستانی تمدنی کی اعلیٰ ترین روایتوں کے وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس لیے زندگی کے جس شعبے میں ردِ عمل کے آثار پائیں گے انہیں اختیار کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔"

کاروان جب چلا تو ایک یا دو زبانوں تک ہی محدود ہو کر نہیں رہ گیا۔ ڈاکٹر عزیزہ بانو نے ٹھیک لکھا ہے:

"اس طرح دو ڈھائی سال کے درمیانی وقفہ میں ترقی پسند ادیبوں کی تحریک کو ہندوستان کی تمام زبانوں میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔"

(فیض کی شاعری میں اشتراکی رجحانات 170)

اس کامیابی کی وجہ تھی بدلتے ہوئے وقت کو سمجھنا اور ایک وسعت النظری کے ساتھ میدان میں آنا۔ پنڈت نہرو نے بہ آوازِ بلند الٰہ آباد میں منعقدہ کانفرنس (1938) میں اپنے بیان میں کہا:

"یہ کہنا کہ سماج واد ہماری انفرادی پہچان کو مٹا دے گا، بالکل غلط ہے۔ آنے والے انقلاب کے لیے دیش کو تیار کرنا ادیبوں کی ذمہ داری ہے۔ آپ عوام کے مصائب کا مداوا کیجیے، ان کو راستہ بتائیے، لیکن آپ کی بات ان کے دل میں اتر جانی چاہیے۔ ترقی پسند لیکھک سنگھ ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے اور اس سے ہمیں بڑی اُمیدیں ہیں۔" (امر اُجالا 24 اپریل 2011)

پھر اس موقع پر رویندر ناتھ ٹیگور کا بھی پیام پڑھا گیا:

"تنہائی سے محبوبیت میری عادت بن گئی ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سماج سے کٹا ہوا ادیب انسانی فطرت سے متعارف نہیں ہوسکتا۔ سماج کو جاننے پہچاننے کے لیے اور اس کے ترقی کے راستے کا پتہ دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارا ہاتھ سماج کی نبض پر ہو اور ہم اس کے دل کی دھڑکنوں کو سنیں...... ادیب کا فرض یہ ہونا چاہیے کہ دیش میں نئی زندگی کی روح پھونکے، بیداری اور جوش کے گیت گائے، دیش، سماج اور ادب کی بھلائی کی قسم جب تک ہر فرد نہیں کھائے گا، اس وقت تک سنسار کا مستقبل روشن نہیں ہوسکتا۔"

(امر اُجالا 24 اپریل 2011)

یہاں پریم چند کے الفاظ بھی لکھنا ضروری ہیں۔ وہ مارکسوادی نہیں تھے لیکن ایک روشن خیال ادیب تھے جو فرقہ پرستی کو کوڑھ سمجھتے تھے اور بقول ان کے: "ہندو مسلم اتحاد حکام کی

نظروں میں خار کی طرح کھٹکتا تھا۔" (پریم چند، متفرقات 93)

"ادیب کا مقصد صرف محفل سجانا اور تفریح کا سامان جٹانا نہیں ہے، اس کا درجہ اتنا نہ گرائیے وہ قوم پرستی اور سیاست کے پیچھے چلنے والی سچائی بھی نہیں' بلکہ اس کے آگے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی سچائی ہے۔"

جب ایسی معطر فضا بن جائے تو فیض اپنی ادبی صلاحیتوں کو پوری طرح نکھار سکتے تھے اور یہی انہوں نے کیا بھی۔ وہ ترقی پسند تحریک کے معماروں میں ایک امتیازی خصوصیت رکھتے ہیں جن کو جیل کی سنگینی اور فوجی حکومتوں کی ہولناکی ہلا نہ سکی۔ اور وہ ایک سلجھے ہوئے انسان کی طرح دربدری کو بھی اپنے پُرسکون انداز میں جھیلتے رہے۔

تقسیم ہند کے بعد ترقی پسند تحریک زخم خوردہ ضرور ہوئی۔ ہندوستان میں پھر بھی وہ کافی حد تک محفوظ رہی۔ گاندھی کو شہید کر کے فرقہ پرست فاشسٹ طاقتوں کو پسپا ہونا پڑا۔ پنڈت نہرو کے عزم نے نئی سرکار کو سیکولرزم کی سمت دکھائی اور امبیڈکر نے بھگوا چولے سے ہندوستان کے آئین کو محفوظ رکھا۔

اور یہی وجہ ہے کہ انسانیت نواز اقدار کافی حد تک محفوظ رہے۔ ہندوستان کے دانشور، ہندوستان کے عوام اور سماجوادی جدوجہد کے شرکا اپنے حالات کی مجبوریوں کے ہوتے ہوئے بھی ان لوگوں کا احترام کرنے، ان سے اپنے رشتے استوار کرنے اور ہر طرح کا ایک صحت مند ماحول بنانے میں کسر نہیں چھوڑتے جب اس کی کوئی امید نظر آتی اور پھر فیض کا ہر جگہ کھلے دل سے استقبال ہوتا۔ نہرو بھی ان کو عزت کی نظر سے دیکھتے اور گجرال بھی ان کے فدائیوں میں سے تھے۔ اور جب پیا کسی پنگھٹ پر پہنچ جاتے تو ہر گگریا تھرکنے لگتی۔

اور یہی سبب ہے کہ ہند کے دانشوروں نے جب فیض کے چلے جانے کی خبر سنی تو ان کے دل تڑپ اٹھے کیا کھو دیا! مگر ساتھ ساتھ یہ حوصلہ بھی دکھایا کہ ہم آپ کی وراثت کو قائم رکھیں گے کیونکہ یہ ہماری سانجھی وراثت ہے۔ دل کا معاملہ بھی ہے اور شعور کا بھی۔ 'اُتر گاتھا' نے فیض پر خاص نمبر نکالا اور شاید ہندی میں یہ اولین ابتدا تھی اس موقع پر ہمارے ساتھی سوئے ساچی کا

اصرار تھا اور کانتی موہن کی زور آزمائش جس کے سبب اس ہندی کے خاص نمبر کے لیے 'فیض اپنے خطوط کے آئینے میں' لکھ بیٹھے۔

اور جب صد سالہ جشن شروع ہونے کو آیا تو ہماری گردن پر مرلی بھائی سوار ہو گئے، ہندی میں لکھنا شروع کیا لیکن یہ سوال بھی اٹھا کہ بھئی اس ہندی زبان سے جڑے ہوئے ادیبوں نے، مدیروں نے فیض کو نہ صرف سراہا ہے، ان پر بہت موزوں مقالے بھی لکھے ہیں کیوں نہیں ان کا ترجمہ شروع کیا جائے۔ ابھی بہت کچھ باقی ہے لیکن جو مواد اکٹھا کرنے کے بعد تشکیل کیا ہے وہ آپ سب کے سامنے ہے۔ اس کتاب کا مقصد ہندی دانشوروں کے قلم سے لکھی ہوئی فیض شناسی، کو روشناس کروانا ہی نہیں بلکہ ساتھ ساتھ الفت کی لہروں کو ایک بار پھر موجزن کرنا ہے۔ فیض کے اس جذبے کو اور شدت سے آگے بڑھاتے ہوئے کرشن چندر نے کبھی کہا تھا "نفرت وجدل کے باوجود ایک تار ہے دلوں کے اندر جو نہیں ٹوٹا ہے اور ٹوٹ بھی نہیں سکتا۔ ہندوستان اور پاکستان میں محبت پھر اُبھرے گی۔ کوئی مانے نہ مانے مگر یہ وقت کا تقاضہ ہے۔ اس لیے لوحِ تقدیر ہے۔"

کرشن چندر بھی نہیں رہے فیض بھی نہیں رہے مگر دلوں میں بسی ہوئی محبت کے تاروں میں جھنکار پھر پیدا ہوگی اور وہ دن دور نہیں جب 'گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے' گی بلکہ دونوں ملکوں کا ہر گوشہ اس کی خوشبو سے مہکے گا۔

اصغر وجاہت سے ایک مکالمہ

ظہور صدیقی

لاہور میں فیض کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر بین الاقوامی جشن 11 سے 14 فروری 2011 منایا گیا۔ اصغر وجاہت صاحب آپ وہاں نہ صرف موجود تھے بلکہ آپ نے ایک مقالہ 'ہندی کی دنیا میں فیض احمد فیض' بھی پڑھا۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں فیض کے پرستار آپ سے پاکستان میں ہوئی ان تقریبات کے سلسلے میں جاننا چاہیں گے مگر اس سے پہلے کہ ہم اس موضوع پر پہنچیں آپ سے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ آپ کیسے ہندی کی طرف راغب ہوئے۔

اصغر وجاہت ماضی کے جھروکے کھولتے ہوئے آہستہ آہستہ بولے:

''کچھ تو ہم نے 'نیا پتھ' فیض جنم شتی خاص نمبر میں لکھا ہے کچھ اور جو باتیں رہ گئیں ہیں ان پر تھوڑا بہت کہہ دینے پر کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے۔ دراصل ہندی میں انکر جمنٹ زیادہ تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بڑے بڑے 'سقراط' موجود تھے جو نئے لوگوں کو لفٹ نہیں دیتے تھے، یہی نہیں ان کے چہرے پر عجیب قسم کی رعونت عیاں رہتی تھی۔ ہمارے وقت وہاں آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری اور رشید احمد صدیقی تھے ان سب کے پاس مسند پر براجمان ہونے کا ہنر تو ضرور تھا مگر شفقت کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ اس کے برخلاف ہندی شعبہ میں رویندر بھنور اور کے پی سنگھ بہت پیارے انسان تھے جو ہر اس طالب علم کی حوصلہ افزائی کرتے تھے جو ہندی کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہو۔

پھر شہر میں 'دینک پرکاش' نکلتا تھا وہاں کے ایڈیٹر لٹھ پنچ ایک سادہ لوح مگر کرمٹھ انسان تھے اور نئے لوگوں کی ہمیشہ ہمت افزائی کرتے تھے۔ اس طرح سے ہم ہندی کی طرف مائل ہوتے چلے گئے۔''

پھر ہم نے پوچھا کہ اصغر وجاہت صاحب آپ نے فیض کی طرف کب دیکھنا شروع کیا؟

اصغر وجاہت نے مسکراتے ہوئے کہا:

''دیکھیے ایک طرف تو ہمارا دور ہی ولولہ انگیز تھا دوسرے جوانی کے دن تھے۔ فیض کی شاعری میں رومانیت بھی تھی اور انقلاب بھی۔ ہم پر ان کے کلام کا جادو ایسا چڑھا کہ ہم نے یعنی مظفر علی اور اصغر وجاہت نے فیض کا کلام حفظ کر لیا تھا، ایک دوسرے کو سناتے رہتے تھے۔ ان کے شعروں میں ایسی جادوئی کشش تھی کہ بار بار نظم یا غزل کو پڑھتے تھے لیکن ہر بار وہ نئی لگتی تھی۔ دراصل فیض کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ وہ الفاظ کو نہ صرف چُن چُن کر لاتے ہیں بلکہ وہ ہر وقت بدلتے رہتے ہیں۔ ان کی صدق دلی، خلوص سے جذبات رجز بن جاتے ہیں۔ دیکھیے اس نظم کو:

آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنھیں رسم دعا یاد نہیں

اصغر وجاہت صاحب ظاہر ہے کہ فیض سے بے حد متاثر رہے اور سن بلوغ کی طرف جاتے ہوئے اگر کسی چیز کا اثر ہو جائے تو وہ زندگی بھر پیچھا نہیں چھوڑتا۔ آج بھی فیض کا نام آتے ہی ان کی آنکھوں میں عہدِ شباب کی چمک ہم نے دیکھی۔ فیض کی شاعری۔ یعنی نظموں یا غزلوں وغیرہ کے بارے میں ادیبوں نے اپنی پسند کا اظہار کیا ہے۔ ان سے بھی ہم نے جب یہ کہا کہ آپ کو کونسی ان کی دو رچنائیں پسند ہیں تو انہوں نے کہا: 'مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ' اور ایک قطعہ:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لیں ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

اب ذکر چل نکلا لاہور کا۔ جو تقسیم سے پہلے شمالی ہندوستان کا سب سے جاندار شہر رہا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ 1947 میں جو خون خرابہ یہاں دیکھنے کو ملا اس سے انسانیت داغ دار ہوئی اور آج بھی جس طرح مذہبی کٹر پنتھی اس کی عوام کو نشانہ بناتے رہتے ہیں وہ بھی نہایت ہی تکلیف دہ بات ہے لیکن پھر بھی لاہور زندہ ہے۔ اسی شہر میں فیض نے اعلیٰ تعلیم پائی اور کافی مدت تک ان کی یہاں رہائش رہی۔ لاہور والے آج کس طرح فیض کو یاد کرتے ہیں اور کس طرح ان کی صد سالہ سالگرہ کی تقریبات ہوئیں ان کے بارے میں اصغر وجاہت سے پوچھنا اس لیے ضروری تھا کیونکہ وہ ایک غائرانہ یعنی پینی نظر رکھتے ہیں اور ان کے دل میں انسانی دھڑکن ہر وقت موجزن رہتی ہے۔ ہاں تو اصغر وجاہت تو کیا رہے آپ کے تاثرات؟

اصغر وجاہت کچھ بشاش نظر آئے: ان کے سرخ رخسار اور چمکنے لگے اور فوراً بولے ''بھئی جب لاہور پہنچے تو زیادہ پر امید نہیں تھے۔ ہمیں لگا یہ سب رسم نبھانے کے لیے ہو رہا ہے یا ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ زیادہ سنجیدگی سے فیض کی صد سالہ سالگرہ (جنم شتی) کو منانے جا رہے ہوں اور کیونکہ ایسی محفلوں میں مختصر لوگ آتے ہیں یہاں بھی کچھ ایسا ہی حال ہوگا۔ لیکن ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی جب کانفرنس ہال میں ہم پہنچے۔ صرف ڈیلیگیٹس ہی نہیں بلکہ ایک بڑی تعداد میں حاضرین بھی تھے اور یہ سب کھسکنے کے ارادے سے نہیں آئے تھے بلکہ جم کر بیٹھنے والے اور جب مقالے پڑھنے شروع ہوئے اس وقت بھی ہمیں لگا کہ انکا رپورا دھیان مضمون پر ہے: ہر اہم بات آنے پر ان کے چہرے کا اتار چڑھاؤ بھی جاری رہا۔ اتنی صدق دلی سے ہم نے ہندوستان میں منعقد کسی ادبی محفل کو نہیں دیکھا۔''

یہاں ہم خود کو روک نہ پائے۔ ایسا کیوں اصغر وجاہت صاحب؟

اصغر وجاہت نے فوراً جواب دیا: ''دیکھئے جہاں تک بچے کھچے ادبی شعور رکھنے والے ادیبوں، فنکاروں کی بات ہے وہ اپنی جگہ پر تلے بیٹھے ہیں۔ جو کچھ ہو سکتا ہے اس کو کرنے میں مستعد رہتے ہیں۔ لیکن ساتھ پاکستان میں، خاص طور پر لاہور میں اپر مڈل کلاس تہذیبی طور پر بہت کلچرڈ ہے۔ وہ ادب نواز بھی ہے اور ادب شناس بھی۔ یہ ادب شناسی چاہے اردو ادب پر مرکوز ہو یا پنجابی پر یا دونوں

پر اس سے ان تقریبات کو ایک نئی زندگی دی۔ ہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ جو ڈیلیگیٹس کے علاوہ لوگ آئے وہ زیادہ ٹکٹ خرید کر آئے جس کی قیمت 200 سے 1000 تک تھی۔

ہر سیشن کامیاب رہا اور سب سے کامیاب وہ کھلا اجلاس تھا جس میں جناح پارک لاہور میں ہزار ہا حضرات و خواتین نے شرکت کی۔''

یہاں پھر ہم سے رُکا نہیں گیا اور بیچ میں بولتے ہوئے کہا: یعنی خواتین بھی تھیں؟

اصغر وجاہت نے فرمایا ''خواتین تھیں ہی نہیں بلکہ ایک اچھی خاصی تعداد میں تھیں۔ خواتین کی کلچرل پروگرام میں حصہ داری پنجابی خواتین کے لیے ان کی روایت کا حصہ ہے اور وہ بڑھ چڑھ کر نہ صرف داد دے رہی تھیں بلکہ اپنے کلچرل شعور کا مظاہرہ بھی کر رہی تھیں بغیر کسی ڈر کے کسی خوف کے۔

''یہ کھلا پروگرام اتنا دل آویز تھا اور اتنا پُر کشش کہ جب پنجابی میں اسٹیج پر گانے شروع ہوئے تو عوام میں بیداری کی ایسی لہر دوڑی کہ زیادہ تر لوگ کھڑے ہو کر، تالیاں بجا کر خود بھی فنکاروں کے ساتھ گانے لگے۔ چاروں طرف فیض کا ہی فیض تھا۔ ان کے انقلابی ترانوں کی جھنکار تھی اور ایسا لگنے لگا کہ ہر فرد فیض بن گیا ہو۔ یہ ہماری زندگی کے حسین ترین اور نہایت ہی خوشگوار و پر شعور لمحات تھے۔ کاش ایک بار ہم پھر ایسا پروگرام دیکھ پائیں!

''ہاں کراچی میں بھی جو پروگرام منعقد ہوا اس میں بھی ہزار، دو ہزار لوگ تھے اور اس میں جب ایک سابق افسرِ اعلیٰ نے فیض کی چار نظمیں زبانی سنائیں تو ان کی بھی سامعین نے پر جوش داد دی۔''

اصغر وجاہت صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ۔ توقع سے زیادہ لاہور میں فیض شناسی کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی۔ ہو سکتا کہ کل آپ اور ہم مل کر ایسا ولولہ انگیز پروگرام فیض کے بارے میں منعقد کر پائیں۔ ابتداء جو ہمت (صفدر میموریل ٹرسٹ) نے کی جہاں ایک ہزار سے زیادہ لوگ پہلی جنوری کو پہنچے اس کا انجام بھی بہت خوب ہوگا۔ یہ بات کہہ کر ہم ان سے جُدا ہوئے۔

ترتیب: ڈاکٹر ریکھا اوستھی

پروفیسر ہربنس مُکھیا سے ایک مکالمہ

ظہور صدیقی

12 اپریل 2011 کو ہم مکھیا صاحب کے گھر پہنچے۔ دانشوروں کے حلقے میں ایک جانا پہچانا نام ہے۔ نصف صدی سے زیادہ آپ تواریخ کے مسائل سے الجھتے رہے اور کروڑی مل کالج' دہلی میں 1960 میں علمِ تواریخ میں ایم اے کیا اور مشہور مورخ ڈاکٹر کنور محمد اشرف کے چہیتے شاگرد تھے۔ دراصل یہ آگ دونوں طرف برابر لگی رہی اور جب ان کی پی ایچ ڈی تھیسس "Historians & Historiography During the Reign of Akbar" کتاب کی شکل میں شائع ہوئی تو یہ اُن کے 'گرو' ڈاکٹر اشرف کے نام معنون کی گئی۔ اور آج بھی ڈاکٹر اشرف کے لیے ان کی عقیدت قائم ہے۔ ان کے اسٹڈی روم میں میز پر ڈاکٹر اشرف کا فوٹو فریم میں آویزاں ہے۔

علمِ تواریخ کے علاوہ ان کی ادب میں بھی دلچسپی قائم ہے۔ ہندی میں بھی کویتائیں گنگناتے رہے اور اردو میں بھی نظمیں لکھتے رہے۔ جہاں ان کی رچناؤں (تخلیقات) میں زندگی کے پیچ و خم کی عکاسی ہے تو دوسری طرف ایک صحت مند زندگی کی آرزو ان کا ایمان ہے۔ جب فیض کا معلّی کا زمانہ شروع ہوا تو مکھیا صاحب اس دنیا میں وارد ہوئے اور فیض تو گذر گئے مگر وہ ابھی تک ان سے رشتے کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ مختصر بات یہ ہے کہ فیض کے چاہنے والوں میں سے ایک ہونے کے ساتھ

ساتھ اس دَور کو دیکھا بھی اور پرکھا بھی۔ اور جب اس کے بارے پوچھا تو انہوں نے کہا:

''فیض ایک بہت پیارے شاعر ہیں ایک بہت اہم شخصیت ہیں۔ لیکن سوال ایک فرد کا نہیں ہے: ہمارا بیسویں صدی کا گزرا ہوا زمانہ ایک امید افزا دور تھا۔ 1917 میں سوویت یونین کی تشکیل ہوئی جو ایک نئے سماجی نظریے پر مبنی تھی۔ لازمی طور پر جو بھی بنیادی تبدیلی ہوتی ہے اس کا اثر ایک ملک تک ہی سمٹ کر نہیں رہ گیا، خاص کر قریبی ملکوں پر گہرا اثر پڑا۔''

پھر کچھ رک کر کہنے لگے:

''پھر یہ انقلابی کیفیت یہیں پر رُک نہ گئی چین میں ماؤ کی قیادت میں کامیاب انقلاب ہوا۔ اور ہاں یہ تو دو بڑے ملکوں کی کہانی تھی لیکن سب سے چونکا دینے والی بات ویتنام اور کیوبا میں ہوئی۔ ان جگہوں کی بات چھوڑیئے جہاں عوامی تحریک زوروں پر تھی آپ یورپ کے ممالک پر نظر ڈالیں: ہزاروں نوجوان ہُو چی منہ، وی ول ون (Ho-Chi-Minh, we will win) کے نعرے لگاتے ہوئے سڑکوں پر آگئے۔ پھر ہو چی منہ کی شخصیت ایسی دل کو چھونے والی تھی کہ ہند۔پاک کے دانشور بھی ان کے سامنے سر جھکانے لگے اور پھر چی گویرا کی بے لوث قربانی کو دیکھئے ان کے شیدائیوں کی ایک لمبی قطار نظر آنے لگی اور اس دور میں فیڈل کیسترو بھی ایک دل آویز شخصیت کے طور پر اُبھرے۔''

کچھ دیر وقفے کے بعد مکھیا صاحب بولے:

''ہم نے جب اس دور میں آنکھیں کھولیں تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ظاہر ہے کہ فیض پر بھی ان تبدیلیوں کا اثر ہونا لازمی تھا کیونکہ وہ صرف ایک پڑھے لکھے شخص نہیں تھے بلکہ بیحد حساس بھی تھے۔ خود ملک میں قومی تحریک آگے بڑھ رہی تھی۔ غرضیکہ ان کی سمجھ نے ایک انگڑائی لی اور دل میں ایک نئے جذبہ نے جگہ بنائی۔ اس کیفیت کا ان کی شاعری پر اثر پڑا وہ انھیں قربانی کے لمحوں اور پر امید فضا کے ترجمان بن گئے۔''

پھر ہم نے مکھیا صاحب سے پوچھا: ''آپ نے تقسیم ہند کا سنگین دور دیکھا ہے اور ذاتی طور پر

بھٹکتا بھی۔ اس کے باوجود آپ کے دوستوں نے آپ کو غلط سمت کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپ نے سیکولرزم کی بقا کے لیے بہت کچھ کام بھی کیا اور لکھا بھی۔ آج کے ماحول میں آپ سیکولر نقطۂ نظر کو پورے برصغیر کے لیے کیوں ضروری سمجھتے ہیں؟

ان کا جواب تھا:

''ہم ہی کیا، جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے کہ یہ اس دور کا تقاضہ تھا اور یہ تمام لعنتوں کے باوجود ایک سُنہرا دور تھا۔ اس لیے انسان وانسانیت کی بقا کے لیے کافی لوگ ایسے تھے جو اپنے ذاتی دکھ درد نقصانات کو بھول گئے اور آنے والے دور کو بہتر بنانے میں لگ گئے۔''

کچھ سوچنے کے لیے رکے اور پھر بولے:

''ہمارا سیکولرزم سے ایک حقیقی رشتہ رہا لیکن اگر غور کریں تو ہمارے پاس اس کے سوا چارہ کیا تھا کہ ہم دنیا میں آکر دنیا کو کھلی آنکھ سے دیکھیں۔ اگر مذہبی کٹرپن اور بانٹنے والے عناصر کامیاب ہوتے ہیں تو اس میں پوری انسانیت کا شدید نقصان ہے۔ کیا کوئی باشعور آدمی اس زہرآلود صورت کو برداشت کرے گا؟ آج جو بھی حادثات ہندوستان میں ہوئے جن کا بابری مسجد و گجرات سے تعلق تھا یا جو حالات پاکستان میں خاص طور پر ضیاء الحق کی فوجی حکومت میں دیکھنے کو ملے اس نے کٹرپنتھیوں کے لیے زمین کافی حد تک ہموار کردی اور آج جو مذہبی جنونیت نے غدر مچا رکھا ہے وہ کسی بھی معقول انسان کے لیے تشویش کا باعث ہے۔ فیض کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ نفرت کی بنیاد پر اپنے وطن پاکستان کو کھڑا نہیں کرنا چاہتے تھے وہ اس کلچر کو باہمی کلچر سمجھتے تھے جس میں 'دونوں' طرف کے ماضی کے دانشوروں، شعرا اور ادیبوں نے ایک اہم رول ادا کیا: اور اسی لیے آج بھی فیض کے لیے اچھے انسانوں وادیبوں کے دل میں عزت ہے۔ ہم کیا کرسکتے ہیں؟ کم از کم یاد تو کرسکتے ہیں اور اسی لیے فیض کی سوسالہ سالگرہ کے سلسلے میں نہ صرف پاکستان میں بلکہ ہمارے یہاں بھی جلسے وجشن ہو رہے ہیں۔

اور تو اور گڑگاؤں میں بھی، جو ہریانہ کا ایک اُبھرتا ہوا شہر ہے اور دہلی سے جڑا ہوا ہے' چند فیض

کے چاہنے والوں نے ان کی یاد میں کچھ کرنے کی ٹھانی اور 12 فروری 2011 کو ایک جلسہ منعقد ہوا۔ میں بھی اس موقع پر کچھ بولا اور امرراج سنگھ نے' جو پیزا ہٹ (Pizza Hut) کے مالک ہیں' نے فیض کا 'آخری' کلام سنایا۔ یہ پروگرام کافی دیر تک چلتا رہا اور 13 فروری کو چھونے میں کامیاب رہا۔''

وہ آگے بولے:

''دراصل فیض ہمارے یُگ کے لیے جو کئی معنوں میں بہت بدلا بدلا نظر آتا ہے relevant ہیں۔ وہ ماضی کے دور کی یاد دلاتے ہوئے بھی اکیسویں صدی میں زندہ ہیں۔ کچھ ایسے اقدار ہوتے ہیں جن کی ہمیں ضرورت رہتی ہے۔ انساں کو معلوم نہیں کتنی صدیوں تک رہنا پڑے اور ظاہر ہے کہ اس کے لیے وہی چیز ہمیشہ موثر رہے گی جو اس کے انسانی جذبات کو طاقت دیتی رہے اور اس کے لیے ایک اچھے، صحت مند ماحول بنائے رکھنے میں مددگار ثابت ہو۔ فیض کی شاعری میں اسی طرح کی چیز ہے۔''

مکھیا صاحب سے یعنی ہربنس مکھیا سے رخصت چاہنے سے پہلے ہم نے پوچھا کہ انھیں فیض کی کونسی دو نظمیں سب سے زیادہ پسند ہیں؟ انہوں نے کہا:

مجھے ایک تو 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے' اور دوسری 'درد آئیگا دبے پاؤں......'

پھر انہوں نے اردو میں لکھ کر ہمیں جو صفحہ دیا، اس میں یہ درج تھا:

'فیض کا ایک بیحد محبوب نظریہ یہ تھا کہ ہم آخری منزل تک نہ بھی پہنچیں لیکن کچھ فاصلے تو طے کر ہی لیں گے اور ہمارے بعد آنے والوں کے کچھ فاصلے مختصر کرجائیں گے۔ ان کے اس نظریہ میں ہمیشہ اُمید کی کرن جھلکتی تھی۔ ان کی اکثر نظموں میں یہ نظریہ واضح ہوا ہے:

ہم چلے آئے لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل دل میں قندیلِ غم

یا

ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہوگا اندھیرے کی فصیلوں کے اُدھر
ان کو شعلوں کے رجز اپنا پتا تو دیں گے
خیر ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی صدا تو دیں گے
دور کتنی ہے ابھی صبح بتا تو دیں گے

ایک عمر کا بڑا حصہ جن دوستوں، جن رفیقوں و واقف کاروں کے ساتھ گذرا ان کے ساتھ جتنے لمحات بھی گزر جائیں بہتر ہیں۔ ہربنس کے ساتھ بھی گذارا ہوا وقت ہمارے لیے باعثِ محبت بھی ہے اور باعثِ فخر بھی۔ اور پھر جب اس وقت میں ان کی ہم شریک بھی شامل ہوں۔ بنانی 'بن کی بَیل' ہمیشہ محبت سے پیش آتی رہیں اور ایسا شاید ہی کبھی ہوا ہو جب انہوں نے بغیر کھانا کھلائے ہوئے ہمیں رخصت کیا ہو۔ ہاں اٹھتے اٹھتے ایک اور عجوبہ واقعہ ہوا، جس کتاب کی یعنی روزنبرگ جوڑے کے خطوط "The Roxenberg Letters" کی ہمیں تلاش تھی وہ ہربنس نے ڈھونڈ نکالی اور یہی نہیں انہوں نے اس میں شامل ایتھل روزنبرگ کی نظم کا ترجمہ بھی کر دیا:

اگر ہم چلے گئے

تم جانو گے، مرے بچّو! اور جانو گے
کیوں گیت ہمارے اُدھورے رہ گئے
کتاب اُدھوری رہ گئی ،کام پورا نہ ہوا

چلے گئے مٹی تلے
غم نہ کھاؤ میرے بچّو، بالکل نہیں
کیوں جھوٹ اور تہمتیں گھڑی گئیں
آنسو جو بہائے ہم نے اور زخم کھائے

یہ ایک اعلان ہے سب کے لیے

زمین مُسکرائے گی، مرے بچّو، مُسکان آئے گی
ہریالی لہلائے گی ہماری تربت پر
بند ہوں گے قتل، دنیا کھِل اٹھے گی
بھائی چارے اور امن سے

کام کرو اور بناؤ، میرے بچو، اور تعمیر کرو
اک یادگار محبت اور مُسرت کے لیے
جس پر انسانیت نازاں ہو،
اس یقین جس پہ ہم قائم رہے
تمہارے لیے مرے بچو، تمہارے لیے

*ایتھل روزنبرگ(Ethel Rosenberg)24جنوری1953

---

*فیض جب جیل میں تھے تو انہوں نے روزنبرگ جوڑے کے خطوط پڑھے تو ان پر رقت طاری ہو گئی اور ایسا گہرا اثر پڑا کہ ان کی مشہور و معروف نظم 'ہم جو تاریک راہوں پہ مارے گئے' ان کے تاثرات کی شکل میں وارد ہوئی۔

ڈاکٹر خلیق انجم سے ایک مکالمہ

ظہور صدیقی

ڈاکٹر خلیق انجم اردو ادب میں ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ وہ ہند کے ان ادیبوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے ابتدائی دور میں نہ صرف فیض کو دیکھا و ہمکلام ہوئے بلکہ ان کے گذرنے کے بعد بھی ان پر ایک قابلِ دید کتاب شائع کی۔ میں ان کے پاس انجمن ترقی اردو ہند کے دفتر میں پہنچا۔ ادھر اُدھر کی کچھ باتیں کرنے کے بعد 'موضوع' پر آ گیا۔ ہاں خلیق صاحب آپ کب فیض سے متعارف ہوئے؟ خلیق صاحب ماضی کی یادوں میں گم ہو گئے اور کچھ وقفے کے بعد بولے:

''میں اور ڈاکٹر اسلم پرویز دونوں اسرار الحق مجاز کے عاشق تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فیض کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ پھر جب کچھ عرصہ بعد فیض کی کتاب 'زنداں نامہ' شائع ہوئی اور پاکستان میں فیض کے قید و بند کے حالات اخباروں میں شائع ہوئے تو ہماری توجہ ان کی شاعری پر ہوئی۔ ان کے اشعار پڑھ کر پہلی بار ہمیں اندازہ ہوا کہ فیض کتنے عظیم شاعر ہیں۔ خاص طور پر اُن کی ایک نظم 'تنہائی' نے ہمیں بہت متاثر کیا۔ یہ نظم میں اکثر پڑھتا تھا۔ فراق گورکھپوری نے اس کے بارے میں جو لکھا ہے اس سے میں قطعی طور پر متفق ہوں، لیجیے اس کے یہ اشعار آپ بھی سن لیں:

پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سُراغ
گُل کرو شمعیں، بڑھا دو مئے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں' کوئی نہیں آئے گا

''فیض کی ایک اور نظم ہے جو قابلِ تحسین ہے 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'۔ اس نظم کا پہلا بند ہے:

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

ایک لمحہ رُکنے کے بعد فرمایا:

''فیض کی نظموں کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ مثلاً 1941 میں ان کا مجموعہ نقشِ فریادی، 1952 میں، دستِ صبا، 1956 میں زنداں نامہ، 1965 میں دستِ تہہِ سنگ، 1971 میں سرِ وادیٔ سینا، 1978 میں شامِ شہرِ یاراں، 1981 میں مرے دل مرے مسافر وغیرہ بیسویں صدی کے اہم ترین شعری مجموعے تھے اور میرا عقیدہ ہے کہ بیسویں صدی کی نوجوان نسل جن کتابوں سے دل و جان سے عشق کرتی تھی، اُن میں یہ شعری مجموعے شامل ہیں اور آج بھی فیض کی شاعری

اکیسویں صدی میں اپنی جگہ بنائے ہوئے ہے۔

بیچ میں بات رُک گئی کیونکہ کچھ اور صاحبان ان سے ملنے آگئے تھے اور جب وہ چلے گئے تو میں نے پوچھا کہ آپ کی فیض سے پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟ خلیق صاحب نے بتایا:

''میری فیض سے پہلی ملاقات کروڑی مل کالج میں ہوئی جہاں میں شعبۂ اردو کا استاد تھا۔ اس وقت ہمارے کالج میں مشہور مورخ ڈاکٹر کنور محمد اشرف بھی شعبۂ تاریخ میں استاد تھے اور میرے بہت مہربان تھے۔ دراصل کروڑی مل کالج اپنے ابتدائی دور میں بھی دلی یونیورسٹی کا ایک اہم ستون سمجھا جاتا تھا۔ اس کے پرنسپل ڈاکٹر سروپ سنگھ ایک سیکولر شخصیت تھے اور اردو ادب کے دلدادہ بھی۔ ان کی کوشش رہتی تھی کہ اچھے ذہن والے و معیاری اساتذہ کالج میں آئیں۔ ڈاکٹر اشرف کے علاوہ شعبۂ معاشیات میں ارن بوس صاحب اور شعبۂ پولیٹکل سائنس میں فرینک ٹھاکر داس، نندلال گپتا۔ نند لال بہت پیارے انسان تھے۔ اور پھر ایسا ماحول بنا جو اکاڈیمک لحاظ سے بھی اور انسانی اقدار کے لحاظ سے بھی آج یاد آتا ہے۔ اس کالج سے جڑے ہوئے لوگوں میں، چاہے ٹیچر ہوں یا طالب علم ہندوستان کی سطح پر اپنی جگہ بنائی۔

''خصوصاً پروفیسر ہربنس مکھیا و پروفیسر ارجن دیو کا علم تواریخ میں نمایاں حصہ رہا۔ پھر دلیس راج گوئل بھی ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ بار بار حکمرانوں کو و دانشوروں کو آگاہ کرتے رہے کہ سیکولزم کی رسّی کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔ اسی طرح کنور بکرم سنگھ نے صحافتی و فلمی دنیا میں اپنی پہچان بنائی۔ مقبول فدا حسین مجبوراً ہندوستان چھوڑ کر چلے گئے لیکن بکرم سنگھ نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ایک بہترین کتاب ان پر لکھنے سے نہیں جھجکے۔ پھر دلّی یونیورسٹی میں جو سیکولر تحریک آگے بڑھی اس میں جن لوگوں نے اپنا رول نبھایا ان میں وید گپتا (مرحوم) ظہور صدیقی اور بدری رائنا ہیں۔ ہاں کروڑی مل کالج سے جن کا بطور طالب علم تعلق رہا ان میں امیتابھ بچن اور کُل بھوشن کھربندا بھی ہیں۔

خلیق صاحب نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا:

''فیض کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے ہندوستان تشریف لائے تھے، یہ واقعہ شاید 1960

کا ہے۔ میرا مرتبہ وہ نہیں تھا کہ میں فیض صاحب کو خود جا کر کالج میں تشریف لانے کے لیے مدعو کرتا۔ میں نے کنور محمد اشرف سے درخواست کی اور وہ چوں کہ فیض بہت بڑے عاشق تھے اور میرے مہربان، اس لیے اُنہوں نے فیض صاحب کو کالج میں مدعو کر لیا۔

''چونکہ میں بزمِ ادب کا صدر تھا، اس لیے مجھ سے فیض پر تقریر کرنے لیے کہا گیا۔ میں نے دو تین دن محنت کر کے فیض پر ایک تقریر تیار کی اور فیض پر ہونے والے جلسے میں یہ تقریر کی۔ اُس وقت تک فیض کی مقبولیت اتنی ہو چکی تھی کہ ان کے آنے سے پہلے ہی کالج کا ہال پورا بھر گیا تھا اور بہت دیر تک فیض اپنا کلام سناتے رہے۔ یہ فیض صاحب کی فراخ دلی تھی کہ ہال میں کچھ نوجوانوں نے اُن سے بعض نظموں کی سفارش کی اور اُنہوں نے بلا تکلف وہ نظمیں سنائیں۔

''میں جب انجمن ترقی اردو ہند میں آ گیا تو 'اردو ادب' کا اڈیٹر بنا۔ میں نے فیض پر 'اردو ادب' کا ایک خاص نمبر شائع کیا۔ چوں کہ مجھے فیض سے غیر معمولی محبت تھی، اس لیے میں نے فیض کے فن اور شخصیت پر اُس زمانے کے اعلا درجے کے نقادوں سے مضامین لکھنے کی درخواست کی۔ مجھے خوشی ہے کہ بیشتر حضرات نے میری درخواست قبول فرمائی۔ اُس وقت فیض کے سوانح بہت کم اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوئے تھے، اس لیے میں نے فیض کے سوانح لکھنے میں بہت محنت کی۔ فیض نمبر شائع کرنے میں سب سے زیادہ حوصلہ افزائی پروفیسر جگن ناتھ آزاد صاحب نے کی۔ میں نے کوشش کی کہ مالک رام، خود پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر ظ۔ انصاری اور فارغ بخاری سے مضامین لکھواؤں جن سے فیض کے سوانح کا احاطہ ہو سکے اور اُن لوگوں نے میرے حال پر کرم کیا اور دل آویز مضامین لکھ کر بھیجے۔ سید سبطِ حسن، احمد ندیم قاسمی، مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور محمد صفدر میر وغیرہ نے فیض کی ادبی خدمات پر بہت اچھے تنقیدی مضامین لکھے۔ اس زمانے میں کچھ لوگوں کے وہ انٹرویو شائع ہوئے جو انہوں نے فیض سے لیے تھے۔ ان میں فیض کا ایلس سے، امرتا پریتم کی باتیں اور طاہر مسعود کا انٹرویو، فیض احمد فیض، جیسے شائع ہوئے تھے بعد میں یہ سب ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوئے۔ فیض کی ابتدائی شاعری کے زمانے میں جوشؔ ملیح آبادی کی گھن گرج کی شہرت تھی مگر فیض

اس گھن گرج سے متاثر نہیں ہوئے۔اُن کے جذبات میں ہمیشہ نرمی رہی۔

مالک رام صاحب نے اپنے ایک مقالے میں لکھا ہے:

''فیض سے میرے تعلقات تقریباً تیس سال سے تھے۔ذاتی حیثیت سے وہ بے حد نرم مزاج، نرم گفتار اور بُرد بار قسم کے انسان تھے۔میں نے کبھی کسی سے درشت کلامی تو در کنار سخت کلامی کرتے بھی نہیں سنا تھا۔''

''مجھے یاد ہے کہ جب جب میری ملاقات فیضؔ سے ہوئی، میں نے اُن کے چہرے پر ایک خاص قسم کی شگفتگی اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دیکھی ہے۔ایک دفعہ فیض کرنل بشیر حسین زیدی کے ہاں کھانے پر مدعو تھے۔اس محفل میں ایک ایسے صاحب تھے جنہوں نے فیضؔ کے ایک دوست شاعر کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔فیضؔ ان صاحب کی باتیں سن کر مسکراتے رہے۔اگر چہ اُنہیں یہ باتیں ناگوار گزر رہی تھیں لیکن فیضؔ نے اُنہیں کوئی جواب نہیں دیا۔''

اور چلتے وقت خلیق صاحب نے بتایا کہ اب انجمن 'فیض احمد فیض تنقیدی جائزہ' کو دوبارہ شائع کرنے جا رہی ہے۔ساتھ ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ واقعی ہندی کے ادیبوں میں واس زبان کے واقف کاروں میں فیض کے لیے ایک صحت مند جذبہ ہے۔اور آپ نے اس طرف جو قدم اٹھایا ہے وہ اردو زبان کے پرستاروں میں ہندی میں ہوئی فیض شناسی کو نہ صرف متعارف کروائے گی بلکہ باہمی رشتوں کو بھی تقویت دے گی۔

رومانیت کا ایک خاص انداز

ارُن کمل

کچھ دن پہلے بات چیت کے دوران ایک دوست نے کہا تھا کہ فیض کی شاعری میں رومانیت ہے جو انھیں حقیقت کی سطح تک پہنچنے سے روکتی ہے۔اس نے یہ کہا تھا کہ ہماری ابھی کی ہندی کویتا فیض کی شاعری کے مقابلے میں بہت آگے جا چکی ہے، یعنی ابھی کی ہندی کویتا جس بیبا کی سے زندگی کے مختلف حصوں کی عکاسی کرتی ہے، وہ بیبا کی فیض میں نہیں ہے۔

ایک رومانیت ہوتی ہے جو چیزوں کی پہچان کو دھندلا کر دیتی ہے، ان کے تیکھے کناروں کو بھی بہت ملائم اور چکنا کر دیتی ہے۔یہ رومانیت تب پیدا ہوتی ہے جب (کسی) چیز سے جتنا لگاؤ ہمارا ہوتا ہے اس سے زیادہ دکھلانے کی کوشش کرتے ہیں۔اس حالت میں اس عیاں حقیقت یا کردار کی گہرائی تک نہ پہنچ کر ہم اس کمی کو رومانیت کے ذریعے پورا کرتے ہیں۔لیکن ایک رومانیت ایسی بھی ہوتی ہے جو چیزوں کے تئیں گہرے لگاؤ سے پیدا ہوتی ہے اور پڑھنے والوں کے من میں بھی ویسا ہی گہرا لگاؤ پیدا کر دیتی ہے۔فیض کی رومانیت ایسی ہی ہے، جس میں ہلکی 'آوارگی' بھی ہے، دوستوں کی سی نزدیکی بھی ہے اور اردو شاعری کا وہ خاص مزاج بھی ہے، جس کے چلتے بہت ہی سنگین موقعوں پر بھی وہ ساقی، مے، میکدہ، عشق، معرفت کی ہی بات کرتے ہیں۔'لاؤ تو قتل نامہ میرا' میں عشق، ساقی، مے اور میکدہ سب موجود ہیں، لیکن یہ سب اصلی معنی کو چھوڑ کر فوری تقاضہ میں ڈھل جاتے ہیں۔عجیب

ابھرا ہے فیض کی شاعری کا:

تہمت تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی
رندوں کے دم سے آتشِ مے کے بغیر بھی
ہے میکدے میں آگ برابر لگی ہوئی
لاؤ تو قتل نامہ میرا، میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

'قتل نامہ' کی وجہ ابھی بھی عشق ہے۔ فیض اردو کے آزمودہ معروف سانچے سے نئی مورتی ڈھالتے ہیں اور جب وہ اعلان کرتے ہیں کہ 'لاؤ تو قتل نامہ میرا میں بھی دیکھ لوں/کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی' تو سارے پرانے سانچے ٹوٹ جاتے ہیں، شبدوں کے پرانے معنی (ارتھ) ختم ہوجاتے ہیں مانو پرانے بیجوں سے نئے پودھے اُگ گئے ہوں۔ اس طرح ان کی شاعری الگ شکل اختیار کرلیتی ہے۔ 'عشق کے تہمت' کے رومانی وعدے سے شروع کر کے فیض اسے 'قتل نامہ' تک لے جاتے ہیں اور یہ اپنے وقت کی انقلابی شاعری ثابت ہوتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ہوتا ہے ایک رومانیت کے تحت ہی۔

رومانیت تو یہاں بھی ہے۔ میرے دل مرے مسافر۔ یعنی کتاب کے نام میں ہی۔ دل کو مسافر کہنا اور اس سے اس طرح مخاطب ہونا گھنگھور عشقیہ شاعری کا ایک خاص انداز ہے۔ لیکن آگے کی دو لائین روئے کے دستانہ کو الٹ دیتی ہیں اور بہت سخت چہرہ ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے:

ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم

اور اپنے گھر کے پتہ کی تلاش کرتا آدمی ہمیں ملتا ہے۔ یہاں پھر 'مسافر' شبد جو پہلی ہی لائن میں ملا تھا، دھیرے دھیرے نئے معنی میں ڈھل جاتا ہے اور گو کہ پہلی لائن دہرائی نہیں گئی 'مسافر' شبد شروع سے آخر تک موجود رہتا ہے بے وطن، بے گھر کے پورے درد کا بیاں کرتا ہوا۔ ایک دوسری نظم

میں فیض کہتے ہیں:

ہم مسافر یوں ہی مصروفِ سفر جائیں گے
بے نشاں ہوگئے جب شہر تو گھر جائیں گے

یہاں فیض کی نجی زندگی کا درد تو ہے ہی، ان سب لوگوں کا درد بھی ہے، جو پوری زندگی مسافر بنے رہیں گے اور شاید آخر تک اپنے گھر، اپنے مقام کو نہ پہنچ پائیں گے۔ ان سب لوگوں میں فلسطینی بھی ہوسکتے ہیں۔ ہم اور آپ بھی— 'نعمتِ زیست' (جیون کا وردان) سے قرض جس کسی کو چکانا ہے، اسے تو 'رہِ عشق' کے 'ہر سخت مقام' سے گزرنا ہی ہوگا:

آنے والوں سے کہو ہم تو گزر جائیں گے

ساری مصیبتوں، دکھوں اور اذیتوں کے بعد بھی فیض کی شاعری زندگی میں ہمارے یقین کو مضبوط کرتی جاتی ہے۔ 'نعمتِ زیست' جس کسی کو ملتی ہے اسے تو قرض بھی چکانا ہی ہوگا۔ واقف تھے ہر ایک رنگ کی انکار سے ہم، ایسی نعمتِ زیست کے لیے تو سارا سنگھرش، ساری مصیبتیں اور جنگ ہے:

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیے اے ارضِ وطن
جو تیرے ارضِ بے رنگ کو گلنار کرے

فیض کی شاعری (کویتا) ایک طرف تو زندگی میں ہمارے یقین (وشواس) کو پختہ کرتی ہے اور دوسری طرف اپنے اصولوں کے لیے، آدمی کی پوری عزت کے لیے ہمیں جان کو ہتھیلی پر لے چلنے کی نیک صلاح بھی دیتی ہے: 'جان دیتے رہے زندگی کے لئے'

فیض کی شاعری بہت ہی اعلیٰ جذبات واقدار (آدرشوں) کی عکاس ہے۔ آدمی کی جو تصویر ہمارے سامنے ابھرتی ہے، وہ ہے ہر ظالم کے خلاف لڑتا ہوا، جان دیتا ہوا آدمی، آدمیت کی خاطر مرتا ہوا آدمی۔ فیض انسان کے جدوجہد سے بھرپور، کبھی نہ جھکنے والے روپ کے شاعر نہیں۔ یہی ان کی مکمل شاعری کی بنیاد ہے:

رسن در گلو پا باجولاں ہمیں

اسی قافلے میں کشاں لے چلا

یہ قافلہ ہے زندگی سے عشق کرنے والوں کا۔ فیض نے فارسی کا ایک ٹکڑا اپنی نظم 'نذر حافظ' میں مستعار لیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے: میرے نصیحت کرنے والے نے یہ کہا کہ عشق میں سوا دکھ کے اور کیا رکھا ہے۔ اے عقلمند ذرا بتا دے کہ بھلا اس سے بڑی اچھائی اور کیا ہے؟

فیض کی شاعری جہاں ایک طرف پوری دنیا میں غموں دکھوں کے بارے میں بتلاتی ہے، وہیں سیاسی معاملوں سے پیدا ہوا آدمی کا جو بالکل نجی دکھ درد ہے، وہ بھی بیان کرتی ہے۔ سبھی سیاسی یا سماجک گھٹناؤں کا تمام شد آخر کار آدمی کے نجی جیون میں ہی ہوتا ہے۔ سیاست اور فرد کی ذاتی زندگی کا اتنا گہرا تعلق ہو گیا ہے کہ ایک سیاسی فیصلہ فیض کو وطن–بدر کر دیتا ہے اور اس تمام مشکلوں، دکھوں کو پیدا کرتا ہے جو آخر کار ایک آدمی کو ہی سہنے پڑتے ہیں۔ شاید یہی سبب ہے کہ فیض کی شاعری سیاسی ہوتے ہوئے بھی ذاتی ہے اور ذاتی ہوتے ہوئے بھی سیاسی ہے۔ (یعنی دل کی گہرائیوں سے اٹھا ہوا سیاسی شعور سماجی بھی ہے اور ذاتی بھی)

فیض سیاسی گھٹناؤں کے انسانی معنی کو بیان کرتے ہیں۔ فیض کے شعر ہم بہت ہی تنہائی کے لمحات میں بھی گا سکتے ہیں اور ایسے موقعوں پر بھی، جب پورا ہجوم پارلیمنٹ کی طرف کوچ کر رہا ہو۔ یہ شاعری کا کافی آگے بڑھا ہوا روپ ہے۔ آج (ابھی) کی شاعری، خاص کر ہندی کی، نہ تو ہماری ذاتی، نجی ضرورتوں کو دور تک پورا کر پاتی ہے، نہ ہی اس لائق ہوتی ہے کہ پورا کا پورا جلوس اسے ترانے کے طور پر گاتے ہوئے، دربار وطن تک جائے۔

فیض کی شاعری کچھ ایسی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے، جو ابھی ہماری اپنی (ہندی) کویتا سے پوری نہیں ہو پاتی یا کم ہو پاتی ہے۔ ایک خاص ضرورت ہوتی ہے جب فیض کہتے ہیں:

جو نہ آیا اُسے کوئی زنجیر در

ہر صدا پر بلاتی رہی رات بھر

تو ایک معمولی آدمی کے لیے انجانے ہی ہمارے دل میں بہت پیار اور ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ کون تھا نہیں آیا یہ نہیں آ سکا؟ اور وہ کون ہے جو انتظار کرتا ہے؟ فیض کی مشہور نظم 'تنہائی':

اپنے بے خواب کیواڑوں کو مقفل کر لو

اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

جس جذبہ کا اظہار کرتی ہے، اسی کی زیادہ عمیق (گہن) لیکن بہت ہی خاموشی (شانت) کا اظہار اس شعر میں ہوا ہے۔ انتظار کے اس لمحے کی پوری بے چینی اور جذباتی مہمان کے نہ آنے سے پیداڈر اور شبہ (آشنکا) کو پورا پورا یہاں رکھ دیا گیا ہے۔ یہاں محرک ہے دروازے کی زنجیر — لیکن ہم اتنا کچھ سمجھتے ہیں، پھول دیکھنے کے پہلے ہی اس کی خوشبو ہم تک آتی ہے اور ایک گہرے دکھ کا احساس ہمیں ہوتا ہے۔ شاعری کی جو شکتی ہوتی ہے ہمیں اپنے اشارے پر نچانے کی، وہ فیض کی خاصیت ہے۔ اس شعر کو دیکھیے:

کچھ پہلے ان آنکھوں آگے کیا کیا نہ نظارہ گزرے تھا

کیا روشن ہو جاتی تھی گلی جب یار ہمارا گزرے تھا

اس شعر میں کچھ ایسا ہے جس کی تشریح شاید ممکن نہیں۔ یہ پوری غزل اپنے بھاؤ اور وزن (وستو) میں دکھ سے بھری ہے اور ایک طرح کی نسٹولجیا (یاد ماضی) سے بھی، لیکن اس کی لے میں ایک مستی ہے، اور کہیں نہ کہیں مسرت کا احساس بھی۔ اس کا آخری مصرعہ ہے:

آنکھ اٹھتے ہی ایک نظر میں عالم سارا گزرے تھا

اس غزل کی لے میں عجب جادو ہے، جو فیض میں ہر جگہ ہے۔ شبدوں کا جادو، لے کا جادو، جو آج بھی شاعری کی ایک خاص خوبی سمجھی جاتی ہے۔

فیض کی دنیا میں قدم رکھتے ہی لگتا ہے— 'کتنے ہاتھوں سے ہم آغوش میرا ہاتھ رہا' فیض کی شاعری کو پڑھتے ہوئے ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ کچھ دوست ہم بھی ساتھ ہوتے۔ فیض کی شاعری لوگوں سے ملنے کی خواہش پیدا کر دیتی ہے۔

'مرے دل میرے مسافر' کی ان نظموں میں زیادہ صبر ہے اور اسی لیے زیادہ تلخی ہے۔ 'لاؤ تو قتل نامہ میرا میں بھی دیکھ لوں/ کہیں کس مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی' کی جڑ شاید یہاں بھی ہو— 'کون قاتل بچا ہے شہر میں فیض/ جس سے یاروں نے رسم وراہ نہ کی' ('شیشوں کا مسیحا)۔ لیکن اب تلخی زیادہ ہے، وزن بھی زیادہ ہے اور معنی بھی کافی پر تفصیل ہو چکا ہے۔ فیض ان نظموں میں بہت کم شبد (لفظ) بولتے ہیں۔ سارے فالتو شبد چھانٹ دیے جاتے ہیں اور اتنا ہی باقی رہ جاتا ہے جتنا بے حد ضروری تھا۔ کبھی کبھی تو فیض اپنے تجربات کو قدیم شاعروں کے تجربات سے جوڑ کر انھیں کے الفاظ سے اپنا کام چلا لیتے ہیں:

ہمیں کیا برا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا

اور شاید یہ بھی اسی اسلوب نگاری کی دین ہے جس سے پرانی نشانیاں (پرتیک) نئے معنی میں نظر آتی ہیں۔ اسی طرح مخدوم کی ایک غزل کے دو مصرعوں کے تانے بانے پر فیض پوری غزل بُن لیتے ہیں، جو مخدوم کی غزل سے جڑی ہونے کے باوجود اس سے کچھ الگ معنی رکھتی ہے۔ 'آپ کی یاد آتی رہی رات بھر/ چاندنی دل دکھاتی رہی رات بھر' یا پھر دوسری کویتا میں: 'اسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب'۔

فیض کے اس مجموعہ ('مرے دل مرے مسافر') میں کئی شکلوں، طرزوں کی کویتائیں ہیں۔ غزل تو ہے ہی، ایک دکنی غزل بھی ہے— 'سب پوچھتے تھے احوال جو کوئی درد کا مارا گزرے تھا' قوالی بھی ہے۔ 'فضا میں بجلیاں لہرائیں پھر سے تازیانے کی/ قلم ہونے لگی گردن قلم کے پاسبانوں کی' اسی طرح گیت بھی ہیں اور نثری نظمیں بھی۔ فیض نے جو پاکستان کے شہری ہیں {جب فیض زندہ تھے} ان میں سے کئی کویتائیں بیروت، پیرس اور ماسکو میں لکھی ہیں جو وہاں کی زندگی سے منسلک ہیں، لیکن حقیقت میں جو سارے انسانوں کی زندگی کے بارے میں ہیں۔ یہ بھی فیض کی شاعری کا ایک دلچسپ پہلو ہے۔ عالمی شاعری کے مقابلے یہ ہے بین الاقوامی شاعری— اس مجموعہ میں دو نظمیں پنجابی میں بھی ہیں۔ فیض کٹھن شبدوں (مشکل الفاظ) عربی، فارسی کے شبدوں اور مزین

الفاظ کے ذخیرے کے لیے مشہور ہیں، لیکن اس مجموعہ میں مشکل الفاظ کمتر ہیں۔ یہاں فیض زیادہ سَرل (آسان) ہیں۔ کویتاؤں کو وہ زیادہ سے زیادہ سُگم (عام فہم) بناتے گئے ہیں۔ اسی سے وہ پنجابی کسانوں سے مخاطب ہوتے ہیں:

اٹھ انساں نو بنا

فیض کی شاعری میں آدمی پورے وقار (گریما) اور شان کے ساتھ موجود ہے۔ مقتل کی طرف جاتے ہوئے بھی اس کا ماتھا نہیں جھکتا۔ آدمی کی خودداری کی اتنا زبردست اظہار ماڈرن کویتا میں بہت کم ہوا ہے۔ یہاں 'لگھو مانوؤں' (بونوں) کی بیچارگی نہیں ہے:

مال والے حقارت سے تکتے رہے
تاں کرتے رہے ہاتھ ملتے رہے

زہر سے دھو لیے ہیں ہونٹ اپنے
لطفِ ساقی نے جب کمی کی ہے
تیرے کوچے میں بادشاہی کی
جب سے نکلے گداگری کی ہے

یہ اس وقت کی شاعری ہے جب

اب کے برس دستورِ ستم میں کیا کیا باب ایجاد ہوئے
جو قاتل تھے مقتول ہوئے جو صید تھے اب صیاد ہوئے

فیض نے اپنے وقت کی اس خاصیت کا بیان کیا ہے۔ اس پوری کتاب (مرے دل مرے مسافر) کو پڑھنے کے بعد یہی لگتا ہے:

جو گزرتے تھے داغ پر صدمے
اب وہی کیفیت سبھی کی ہے

فیض احمد فیض: دُکھ جو ہمارا بھی ہے اور تمہارا بھی

دُوارکا پرساد چارومتر

(اداریہ 'انبھے سانچا' جنوری۔ مارچ 2011، شمارہ 21)

فیض احمد فیض اس برِّ صغیر کے عظیم شاعر ہیں۔ ان کی ہندی۔ اردو اور بہت سی زبانوں میں ہر دلعزیزی اور مقبولیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پیدائش کی صد سالہ سالگرہ ہمارے دیش میں ہی نہیں پوری دنیا میں منائی جا رہی ہے۔ چھوٹے ادبی رسالے بھی ان پر لکھی ہوئی تحریروں کو شائع کرتے ہوئے شاعری میں ان کی دین کو یاد کر رہے ہیں۔ یہ کام 'انبھے سانچا' میں بھی ہو رہا ہے۔ اس شمارے کے ایک مخصوص حصے میں ان کے متعلق تحریریں شائع کی جا رہی ہیں۔

اردو شاعری کا اپنا ماحول و مزاج ہے۔ اس کے اثرات کی اہمیت کو دیکھا جائے تو اس میں بہت کچھ ایسا ہے جو حیران کرنے کے ساتھ ساتھ پُرکشش بھی ہے۔ یہ طاقت اردو شاعری میں کسی چمتکار یا جادو سے نہیں آئی: اس کی وجہ ہے زندگی سے گہرا اور مسلسل رشتہ۔ تھوڑا غور کریں تو اردو کی شاعری کے پس منظر میں تین جز اہم کردار نبھاتے ہیں۔ اداسی، خودداری اور قلندری (پھکّڑ پن)۔ فیض کی شاعری ان میں ایک اور جز جوڑتی ہے، اس جز کا نام ہے انقلابی جذبہ۔

میر، غالب، سودا، یگانہ، اقبال، فیض اور فراق سے چل کر بالکل ہمارے دور کی ماڈرن اردو

شاعری میں یہ تینوں جز کسی نہ کسی صورت میں دیکھے، پَرکھے جا سکتے ہیں۔ غالب جب کہتے ہیں: کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ' تو یہاں تنہائی میں چھپی زندگی کی اداسیاں بھی ہیں۔ میر کا مشہور شعر ہے:

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے

اس شعر میں ایک ایسی کیفیت ہے جو شاعر کے دُکھ کا بیان کرتی ہے۔ اس دکھ کا نتیجہ ہے اُداسی، یہ اداسی اتنی گہری ہے کہ نیند میں بھی جاگتی رہتی ہے۔ روتے روتے سو جانے والے آدمی کے چہرے پر اُداسی نقش ہو جاتی ہے۔ غالب کہتے ہیں: 'گھستا ہے جبیں خاک میں دریا میرے آگے'۔ یہاں شاعر کی دھج اور اس کی خودداری کو ہم یقیناً محسوس کرتے ہیں۔ خودداری اقبال کی شاعری میں کسی مرکزی طاقت کی طرح ہے۔ وہ کہتے بھی ہیں: 'خودی نہ دیکھ، فقیری میں نام پیدا کر'۔ ایک دوسرے شعر میں اقبال انسانی شکستگی میں بھی خوبصورتی کا بھی احساس کراتے ہیں: 'کہ شکستہ ہو تو ہے عزیز تر یہ نگاہِ آئینہ ساز میں'۔ میر کی شاعری میں بھی خودداری، اُداسی اور قلندری کا مسلسل احساس ہوتا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے:

میر کے دین و مذہب کو تم کیا جانو ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دَیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

میر ایک پکے اور سچے مسلمان تھے۔ باوجود اس کے اُن کی قلندری کی انتہا ہی تو ہے کہ وہ تِلک لگا کر مندر میں جا بیٹھے اور اسلام کو 'ترک' کرنے کی بات کرتے ہیں۔ شاعر کا مسلک انسانیت ہوتی ہے۔ اردو کی شاعری کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انسانیت نواز ہے۔ فیض نے اس انسانیت نواز روایات کو اپنی ترقی پسند خیالات اور انقلابی جذب کے ذریعہ پروان چڑھایا ہے۔ انسانیت کے حمایتی فیض ناانصافی و استحصال کے خلاف اپنی آواز بلند کرتے ہیں۔ یہ آواز شاعر کی آواز تو ہے ہی شاعری کی بھی آواز ہے اور یہی آواز جب سفر پر نکلتی ہے تو عوام کی آواز ہو جاتی ہے۔

فیض کی بے حد مقبول نظم ہے: 'ہم دیکھیں گے، لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے' یہ 'دیکھنا' کسی منظر کا دیکھنا نہیں ہے۔ اس دیکھنے میں کتنے سارے دکھتے ہیں! پوری نظم میں ایک للکار ہے، ایک گونج ہے جو عام لوگوں کے گنبد سے ہو کر آتی ہے اور عام لوگوں کا ترانہ بن جاتی ہے۔ اس نظم میں بے چینیاں کروٹ بدلتی ہیں اور اداسی کسی زخمی پرندہ کی طرح پھڑ پھڑاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ نظم فن کی اونچائیوں کو بھی چھوتی ہے اور خود کو نعرہ نہیں بننے دیتی بلکہ ہمارے ضمیر کو چھوتی ہے اور تسکین دیتی ہے۔ شاعر جب کہتا ہے 'ہم دیکھیں گے' تو یہ دیکھنا کسی امید کی طرح بھی ہے اور چنوتی کی طرح بھی ہے۔ یہ دیکھنا اس شعور کا نام ہے جو انجماد کو جھنجھوڑتا ہے۔ فیض کی شاعری (اور ساحر، مخدوم، راہی معصوم رضا، سردار جعفری جیسے ترقی پسند شاعروں کی شاعری سے گزرتے ہوئے) کو پڑھ کر بار بار محسوس ہوتا ہے کہ ایک توڑ پھوڑ جاری ہے۔ یعنی انجماد سے انکار۔

اردو شاعری میں اس کی ایک لمبی روایت ہے۔ صوفی شاعروں نے عشق مجازی کو عشق حقیقی کو جوڑا تھا۔ ترقی پسند شاعری نے اس میں عشق عوام کو جوڑا۔ فیض کا عشق کتنا معنی خیز ہے۔ ان کا عشق سطحی نہیں، وہ ذاتی نہیں۔ وہ عاشق کرتے ہیں لیکن لاکھوں لوگوں کے دُکھ بھی ان کی زندگی کا حصہ ہو جاتے ہیں۔ فیض اپنی محبوبہ سے کہتے بھی ہیں: 'اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا'۔ یعنی شاعر کے دل کے ایک کونے میں محبت ہے تو دوسرے کونے میں زمانہ کے دکھ بھی بسیرا ڈالے ہوئے ہیں۔ اس مصرع کے ایک لفظ پر غور کریں، وہ ہے 'دکھ'۔ فیض اس مصرع کو یوں بھی کہہ سکتے تھے: 'اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا' لیکن انہوں نے 'دکھ' کا استعمال کیا۔ غم ایک شخص پر مرکوز دکھائی دیتا ہے۔ 'دکھ' میں سماجکتا (سماجیت) ہے۔ فیض کی شاعری کی یہی تو خوبی ہے۔ وہ الفاظ کو بڑی ہی احتیاط اور نفاست سے استعمال کرتے ہیں۔ الفاظ کی عظمت شاعری کی گریما (عظمت) بن جاتی ہے۔ حیران کر دینے والی بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے ایسے شبدوں (الفاظ) کو اپنی شاعری میں استعمال کیا جن میں ذو معنی شاعری ہو چکی تھی۔ یہ فیض کا کمال ہے کہ انہوں نے انھیں الفاظ سے انقلابی جذبہ کی شاعری کو ڈھالا اور وہ بے ساختہ ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے کہہ سکے:

کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے

فیض کی انقلابی شاعری زندگی کی حقیقتوں پر مبنی ہے۔ اس میں محبت کے شدید احساسات بھی ہیں دکھ اور اُداسی کے منظر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اُداسی کی تحریریں اس لیے بھی ہیں کہ فیض جس دنیا کا تصور کرتے تھے ویسی دنیا کے خواب پاکستان میں دُھندلے ہوتے جا رہے تھے۔ انسانی تکلیفیں، غلامی کی زنجیریں، استحصال، خوف، بدحالی اور بدامنی، ان سب باتوں نے فیض کو بے حد وچلت (بے قرار) کیے رکھا۔ پھر بھی ان کا حوصلہ و جذبہ تو دیکھئے:

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

وہ عشق کو یار کی گلیوں سے نکال کر وطن، عوام اور انقلاب کی گلیوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ فیض کی شاعری میں ایک دوسرا رنگ بھی ہے۔ مستی کا قلندری کا۔ دکھ، اُداسی، خودداری اور انقلابیت کے علاوہ مستی کا ہونا اہم ہے۔ یہ شاعر کا قلندرانہ مزاج ہی تو ہے جو ان کے عشق کو اتنا وسیع بنا دیتا ہے اور انقلابی شاعری کو ہوائی نعروں میں تبدیل نہیں ہونے دیتا۔ اس طرح شاعری میں 'گلشن کا کاروبار' چلتا رہتا ہے۔ فیض کی شاعری اردو شاعری کی اس روایت کی طرح جہاں خدا سے چھیڑ چھاڑ جاری رہتی ہے ایک اچھوتا انداز دیکھنے کو ملتا ہے:

ایک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

ترقی پسند اردو شاعروں نے ایک انداز سے 'پروردگار' سے گلہ کیا ہے مگر یہ ذاتی گلہ نہیں ہے۔ مصیبتوں کا پہاڑ جب خلقِ خدا پر ٹوٹنے لگتا ہے تو یہ طنز یہ شکایت عوام کے دُکھی دل سے اٹھی ہوئی آواز کی ترجمانی کرتی ہے۔

فیض نے ایک جگہ کہا تھا کہ بے وجہ شعر کہنا کوئی گناہ تو نہیں لیکن عقلمندی بھی نہیں۔ غور سے

دیکھیں تو فیض کی شاعری وجوہات کی شاعری ہے۔ فیض نظم یا غزل کہتے ہیں تو ایک وجہ ہوتی ہے۔ ان کی شاعری انسانوں کے دکھ درد، جدوجہد، ٹریجڈی اور خوف کے اندھیروں پر کہکشاں کا احساس کراتی ہے۔ اگر واقعات دل پر آری چلانے والے ہوں تو فیض کی شاعری پڑھتے وقت ہم بیشک اداس ہو جاتے ہیں لیکن یہ ہی اُداسی کی لے جدوجہد کی انگلی پکڑ کر زندگی کے اُجالوں تک بھی لے جاتی ہے۔ اندھیرا کتنا بھی گھنا ہو امید کی کرن بنی رہتی ہے۔ جدوجہد اور انسانی مستقبل میں یقین کے دامن کو فیض کبھی نہیں چھوڑتے:

یوں ہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی
یوں ہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

(اس شمارہ کی ادارت میں شری مرلی منوہر پرساد سنگھ سے ہمیں بہت مدد ملی ہے، اس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔)

*ہندی کی دنیا میں فیض احمد فیض

اصغر وجاہت

ہندی کی دنیا بہت بڑی ہے — ہندی دنیا کی دوسری سب سے بڑی زبان ہے جس کو بولنے والے پچاس کروڑ ہیں اور سمجھنے والوں کی تعداد اسّی کروڑ بتائی جاتی ہے۔ ہندی کے صرف دس بڑے اخباروں کو پڑھنے والوں کی تعداد بیس کروڑ سے زیادہ ہے۔ ہر سال قریب بیس ہزار کتابیں چھپتی ہیں۔ ہندی میں سو سے زیادہ ادبی رسالے نکلتے ہیں جن میں ہندی کا ہی نہیں دنیا بھر کا ادب چھپتا ہے۔ ہندی فلم اور ٹی وی 'انڈسٹری' نے ملک اور دنیا کو ایک کر لیا ہے۔

ہندی کی یہ بھری۔ پری دنیا 'فیض احمد فیض' کو اپنا اور بالکل اپنا شاعر مانتی ہے۔ یہ صرف اتفاق نہیں کہا جائے گا کہ فیض کی کتابیں جیسے جیسے پاکستان میں آتی رہیں ویسے ویسے وہ ہندوستان میں بھی چھپتی رہیں۔ صرف 'راجکمل پرکاشن' نے 'شیشوں کا مسیحا'، 'میرے دل میرے مسافر' اور 'پرتی ندھی یعنی نمائندہ کویتاؤں' میں فیض کو چھاپا ہے۔

ہندی کے بڑے شاعر شمشیر بہادر سنگھ نے جنھیں شاعروں کے شاعر مانا جاتا ہے، فیض کا ایک 'سلیکشن' تیار کیا تھا جو راج کمل نے ہی چھاپا تھا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ 'فیض' ہندی والوں کے لیے

---

*لاہور میں منعقد فیض احمد فیض کے پیدائش صد سالہ کے جشن کے موقع پر 11 سے 14 فروری 2011، یہ مقالہ ہندی ادب کے مقبول ادیب پروفیسر اصغر وجاہت نے پیش کیا۔

کبھی اجنبی نہیں رہے۔ 'راجکمل پرکاشن' نے اس سلسلے میں ایک بڑا کام 'سارے سخن ہمارے' چھاپ کر کیا تھا۔ یہ کتاب 1987 میں چھپی تھی۔ اس کے کور پیج پر ایم ایف حسین کا بنایا فیض کا اسکیچ ہے۔ 'سارے سخن ہمارے' کے مدیر ہندی کے مشہور افسانہ نگار اور شاعر عبدل بسم اللہ نے بتایا ہے کہ ہندی میں شائع 'سارے سخن ہمارے' کے لیے لندن میں چھپے 'نسخہ ہائے وفا' اور 'سارے سخن ہمارے' کو بنیاد بنایا گیا تھا۔ لیکن دیکھنے میں یہ آیا کہ ان دونوں 'کلیکشن' میں کچھ آدھی ادھوری غزلیں/نظمیں ہیں جنھیں دوسری کتابوں سے چیک کیا گیا اور ترتیب دی گئی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہندی کے 'سارے سخن ہمارے' میں فیض کی وہ شاعری بھی ہے جو اردو کے کسی دوسرے 'کمپلیٹ ورکس' میں نہیں ہے۔ مثال کے طور پر 'فیض' نے اپنی غزلوں کے مغنی اور مشہور میوزک ڈائریکٹر انل بسواس کی آواز کی تعریف میں ایک قطعہ لکھ کر انل بسواس کو دیا تھا یہ قطعہ ہندی کے سارے سخن میں شامل ہے۔ ڈاکٹر بسم اللہ کے مطابق، فیض کا یہ قطعہ کہیں اور نہیں چھپا ہے۔ قطعہ یہ ہے:

ہر اک حرفِ تمنا اس اضطرار میں ہے
کہ پھر نصیب ہو دربارِ یار بندہ نواز
ہر اک غزل کا سفینہ اس انتظار میں ہے
کہ آئے مثلِ صبا پھر انل کی آواز

فیض کی کچھ ایسی غزلیں اور نظمیں بھی ہیں جو ہندی میں چھپے 'سارے سخن ہمارے' کے علاوہ کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ یہ چیزیں الگ الگ اخباروں اور لوگوں سے حاصل ہوئی ہیں۔ 'گر ہمت ہے تو' بسم اللہ' نظم کے علاوہ، نیس ایسی غزلیں نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں جو کہیں اور نہیں چھپی ہیں۔ پہلے ایڈیشن کے چھپنے کے بعد فیض کے ایک چاہنے والے نے 'فیض' کی ایک غزل بسم اللہ صاحب کو بھیجی تھی اور کہا تھا کہ یہ 'فیض' کی غزل ہے جو 'سارے سخن ہمارے' میں شامل نہیں ہے۔ ڈاکٹر بسم اللہ نے بتایا کہ جب اس کی تصدیق ہو گئی تھی کہ یہ فیض کی غزل ہے تو اسے بھی ہندی والے 'سارے سخن' میں شامل کر لیا گیا تھا۔

'سارے سخن ہمارے' کا پہلا ایڈیشن 1987 میں چھپا تھا۔ اس کے بعد 1991، 1993، 2000، 2009 میں لگاتار ایڈیشن آتے رہے۔ اب 'سارے سخن ہمارے' پیپر بیک میں بھی چھپ چکا ہے۔ راجکمل گروپ آف پبلیکیشن کے چیئرمین اشوک مہیشوری کا کہنا ہے کہ 'فیض' ہندی کے پڑھنے والوں میں اس طرح مقبول ہیں جیسے کوئی دوسرا ہندی (کوی) شاعر ہے۔ ان کے پڑھنے والوں کی تعداد لگاتار بڑھ رہی ہے۔ 'فیض' ایسے شاعروں میں ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتے رہتے ہیں۔ ہندی میں فیض کا اتنا ہی ادب کیا جاتا ہے جیسے ہندی کے بڑے سے بڑے کوی (شاعر) کا ہوتا ہے۔''

1980 کے قریب دلی میں 'سرِ وادیِ سینا' کا ایک چوری کیا گیا ایڈیشن اردو میں چھپا تھا۔ میں نے اس کا ذکر ہندی کے مشہور شاعر اور اس زمانے میں ہندی کا ہفتہ وار 'دنمان' کے مدیر رگھوبیر سہائے سے کیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ 'فیض' دنیا کے بڑے شاعروں میں گنے جاتے ہیں۔ ان کا نیا مجموعہ چاہے جس طور پر چھپا ہوا ہو، ہمیں اس کا نوٹس لینا چاہیے اور انہوں نے 'دنمان' میں 'فیض' پر میرا ایک مضمون 'میرا سرمایہ یہی ہاتھ تو ہیں'' چھاپا تھا۔

ویسے تو فیض ہندی میں لگاتار چھپتے اور پڑھے جاتے رہے ہیں کیونکہ فیض تیسری دنیا کی بنیادی جدوجہد کا حصہ بن چکے ہیں۔ ہندوستان کے جمہوری اور سیکولر جدوجہد میں حق اور انصاف کے لیے نکلنے والے جلوسوں میں، ہڑتالوں میں، کھیتوں اور کھلیانوں میں، کل۔کارخانوں میں استحصال کے خلاف اٹھنے والی آوازوں میں 'انسان دوستی کے نعروں میں' برابری کے لیے لڑی جانے والی جنگ میں، پیار و محبت کے نازک رشتے میں 'فیض' موجود ہیں۔ میں نے راجستھان سے بنگال تک اور اترانچل سے مدھیہ پردیش تک 'فیض' کی شاعری کو ہتھیاروں کی طرح استعمال ہوتے دیکھا ہے۔

ایمرجنسی کے زمانے میں جب پورے ملک کے اپوزیشن لیڈر جیل میں تھے، اخباروں کے ایڈیٹر سزائیں کاٹ رہے تھے، گرفتاریاں اور سزاؤں کی چکی چل رہی تھی تب لوگوں کے دلوں میں بیٹھے ڈر و خوف کے توڑنے میں 'فیض' اپنا رول نبھا رہے تھے۔ سیاہ اور ڈراؤنی راتوں میں دلی کی

جواہر لال یونیورسٹی (JNU) کے کیمپس میں، شُبھ نقوی کی گرجدار آواز میں فیض کا کلام نئی ہمت اور حوصلہ بڑھاتا تھا۔ یہ لگتا تھا:

جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

ایمرجنسی کے بعد 'فیض' جب دلی آئے تھے تو انھیں جے این یو (JNU) کے کیمپس میں بلایا گیا تھا۔ اس میٹنگ کا ذکر کرتے ہوئے ہندی کے ایک بڑے شاعر کیدار ناتھ سنگھ نے اپنے مضمون 'میں نے فیض کو دیکھا تھا' میں لکھا ہے کہ فیض کا آنا ایک بہت بڑے جشن کی طرح تھا، ایک چھوٹی موٹی تحریک کی طرح جس میں ساری دلی اُمڈ پڑی تھی۔ بھیڑ کا عالم یہ تھا کہ اس بڑے سے پنڈال میں سب سے آخر میں سب سے لمبا جو آدمی کھڑا تھا اس کا نام ہے، مقبول فدا حسین۔''

فیض کی جنم شتی (صد سالہ سالگرہ) کے موقع پر ہندی رسالوں کے خاص نمبر نکل رہے ہیں۔ نیا پتھ (نیا راستہ) نے ابھی حال ہی میں فیض پر خاص نمبر نکالا ہے۔ 400 سے زیادہ صفحوں میں فیض کی شاعری اور شخصیت پر تمام مضامین چھاپے گئے ہیں۔ نیا پتھ کے ایڈیٹر مرلی منوہر سنگھ پرساد اور چنچل چوہان نے اپنے اداریہ میں لکھا ہے کہ فیض ظلم اور خلق کے بیچ چل رہی نا ختم ہونے والی جدوجہد کی سمجھ رکھنے والے بہت بڑے شاعر ہیں۔ اس کے علاوہ پروفیسر کملا پرساد نے 'وسودھا' میں فیض پر بہت کچھ چھاپا ہے۔

فیض کے صد سالہ سالگرہ کے موقع پر ہی نہیں اس سے پہلے بھی ہندی میں فیض پر خاص نمبر نکل چکے ہیں۔ ہندی کے ایک رسالے 'اُتّر گتھا' کے ایڈیٹر سوئے ساچی نے فیض پر 1985 میں ایک خاص نمبر نکالا تھا۔ شاید ہندی میں فیض پر یہ پہلا خاص نمبر تھا۔

'نیا پتھ' (نیا راستہ) کے ساتھ ساتھ بہار سے نکلنے والے ایک بڑے اخبار 'پربھات خبر' نے اپنے دیپاولی (دیوالی) خصوصی نمبر میں فیض پر ایک پورا سیکشن چھاپا ہے۔ 'پربھات خبر' میں ہندوستان کے

دوسرے بڑے شاعروں کے ساتھ فیض کو اس طرح یاد کیا ہے، جیسے فیض بھی اپنے، بالکل اپنے ہیں۔ اخبار نے رویندر ناتھ ٹیگور، مجاز، شمشیر بہادر سنگھ، کیدار ناتھ اگروال، اگیے، گوپال سنگھ نیپالی اور تیلگو شاعر شری شری کیساتھ فیض کو پوری اہمیت دی ہے۔ فیض پر احمد فراز کی نظمیں چھاپی ہیں۔ فیض کے چُنیدہ کلام کے ساتھ فیض پر تین بڑے مضامین چھپے ہیں۔

ہندی نے فیض کو اپنا لیا ہے۔ ویسے بھی کسی بڑے شاعر کو کسی ایک زبان یا ملک سے باندھا نہیں جا سکتا وہ تو ہر دل کو گرماتا رہتا ہے۔

*نرواسن کے درد کا احساس

چنچل چوہان

مشہور مابعد نوآبادیاتی مفکر ایڈورڈ سعید نے دوسرے مغربی دانشوروں کی طرح نرواسن (دربدری) کے شکار یا مہاجر ادیبوں اور عوام کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اپنے اسی اصولی فکر کے بیچ انہوں نے محمود درویش اور فیض احمد فیض کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ فیض سے بیروت میں ان دنوں ملے تھے جب پاکستان میں ضیاءالحق کی فوجی تاناشاہی فیض جیسے جمہوریت پسند ادیبوں اور دانشوروں پر کسی بھی طرح کا قہر برپا کر سکتی تھی۔ فیض سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ایڈورڈ سعید نے اپنے ایک مضمون 'نرواسن پر کچھ چنتن' میں لکھا:

> ''کئی برس پہلے میں نے اپنے زمانے کے اردو کے عظیم تر شاعر فیض احمد فیض کے ساتھ کچھ وقت بتایا تھا۔ وہ اپنے وطن پاکستان میں ضیا کی فوجی سرکار کے چلتے جلاوطن ہو کر بیروت آگئے تھے جہاں ان کا ایک طرح سے استقبال ہوا۔ فلسطینی ان کے قدرتی طور سے جگری دوست تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ان میں آپس میں بڑی گہری اپنائیت تھی جبکہ نہ تو زبان یا شعری روایت یا زندگی کی تاریخ ہی ان سے ملتی جلتی تھی۔ صرف ایک بار میں نے فیض کو اپنے نرواسن (در

*نرواسن: دربدری

> بدری) کے درد سے نجات پاتے ہوئے دیکھا تھا جب ان کے ایک پاکستانی دوست اقبال احمد بیروت آئے تھے جو خود بھی دربدر تھے۔ ہم تینوں ایک گندے سے ریسٹورینٹ میں دیر رات تک جمے رہے، فیض اپنی نظمیں سناتے رہے۔ کچھ دیر بعد اقبال اور انہوں نے ہمارے لیے نظموں کا ترجمہ کرنا بند کر دیا۔ جیسے رات گزرتی گئی اس سے کوئی دشواری پیش نہیں ہوئی۔ جو میں دیکھ رہا تھا، اس کے لیے کسی ترجمے کی ضرورت درکار نہیں تھی۔ یہ تاثرات ایک طرح سے مزاحمت (پرتی رودھ) کی لے سے بھری گھر واپسی جیسا تھا، مانو وہ کہہ رہے ہوں ''اے ضیاء لو ہم آگئے، لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے۔'' ضیاء تو اصلیت میں اپنے ملک میں ہی تھا، وہ ان کی مزاحمت کی آواز نہیں سن رہا تھا۔''

ایڈورڈ سعید نے فیض کے ساتھ اپنا وقت گزارنے کی اتنی بھر داستان لکھی لیکن اتنے سے ہی دربدری کے اس درد کا احساس ہمیں ضرور کرا دیا جسے فیض نے اپنی زندگی کے کئی برسوں تک یا تو جیلوں میں رہ کر جھیلا تھا یا پھر دوسرے ملکوں میں رہ کر۔ ان کے اس درد کو اب اس حقیقت میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جو فیض کے نظم سنانے کے انداز میں چھپی ہوئی رہتی تھی اور جس سے سننے والوں کو شکایت رہتی تھی۔ مجھے بھی انھیں سننے کا موقع ملا تھا۔ نئی دلی کے فکّی (FICCI) آڈیٹوریم میں ان کا جلسہ منعقد تھا جس میں انہوں نے نظمیں اور غزلیں سنائیں اسی غیر نوٹنکی انداز سے جس کا ذکر اکثر لوگ کرتے تھے۔ اوما شرما نے ان کی غزلوں پر مبنی ایک ڈرامائی رقص تیار کیا تھا جس سے جلسہ میں ایک رنگ آگیا تھا، پھر بھی وہ نغمگی سننے کو نہیں ملی جو اقبال بانو کی 'لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے' کی چنوتی بھری آواز میں ان دنوں سہیل ہاشمی کے پاس کے ایک کیسٹ سے سنی تھی اور اس کی کاپی اپنے پاس میں نے رکھی تھی۔ اب تو اسے انٹرنیٹ پر آسانی سے اقبال بانو کی ویڈیو ریکارڈنگ میں سنا جا سکتا ہے۔

فیض کی شاعری میں ''درد' اور'' تنہائی' شبد بار بار آئے ہیں، لیکن یہ شبد جدیدیت پوشوں کی طرح اوڑھے ہوئے 'اکیلے پن' یا 'دکھ سب کو مانجتا ہے' کے فارمولے میں ڈھلا 'درد' کی بیان بازی نہیں ہے، یہ تو ایک الگ طرح کے احساس سے پیدا ہوئے الفاظ ہیں۔ سجاد ظہیر نے اس طرح کے

اکیلا پن کو فیشن کے طور پر اپنایا ہوا اکیلا پن بتایا تھا۔ ہندی ادب میں اگیے نے اسی طرح کا 'اکیلا پن' اوڑھا ہوا تھا اور لکھا تھا کہ 'یہ ہی سب چیزیں تو پیار ہیں یا اکیلا پن'۔ یہ تو عام کہاوت ہے کہ 'جا کے پیر نہ پھٹی بوائی / سو کا جانے پیر پرائی (جس کے پاؤں کی (ایڑی کی) کھال نہ پھٹی ہو، وہ دوسرے کا درد کیا جانے)

ایڈورڈ سعید نے بھی نرواسن (دربدری) کے درد کا فلسفیانہ جائزہ لیتے ہوئے اس سچ پر زور دیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ بیسویں صدی کے پیمانے پر، نرواسن کی گھٹناؤں کو نہ تو خوبصورت طرزِ بیاں سے اور نہ ہی 'آدمیت' کے نظریے سے ٹھیک سمجھا جا سکتا ہے۔ دربدری سے منسلک ادب تو صرف اس درد اور اس کے انجام کو ایک شے میں بدل بھر دیتا ہے جس درد سے ہو کر زیادہ تر لوگ خود نہیں گزرے ہیں۔ یہ سچائی ہے کہ دربدر ہونا جس نے بھگتا ہے، وہ اس کا جس گہرے احساس کے ساتھ بیان کر سکتا ہے، وہ دوسرا کوئی نہیں کر سکتا۔ فیض اپنے اس احساس کو یوں کہتے ہیں:

کہیں تو کاروانِ درد کی منزل ٹھہر جائے
کنارے آ لگے عمرِ رواں یا دل ٹھہر جائے
اماں کیسی کہ موجِ خوں ابھی سر سے نہ گزری
گزر جائے تو شاید بازوئے قاتل ٹھہر جائے

فیض کی شاعری کا ملاحظہ کرنے والے مُکتی (نجات) کا انتظار کرتے ہیں، یہ نجات کی آرزو (مکتی کامنا) ان کی اپنی کسی جیل سے رہائی یا اپنے وطن سے دور رہنے کے درد سے نجی نجات سے جڑی ہوئی نہیں ہے۔ اسی لیے وہ نجی یا رِیکل لگتی ہوئی بھی ایک ڈرامائی طور پر حقیقی بیان بن جاتی ہے۔ کیونکہ اس میں تو اس سماجی نظام سے نجات پانے کا انتظار ہے جو ابھی حاصل نہیں ہوئی۔ نجات کی اس صبح کا انتظار ہے جس میں آدمی کے ذریعے آدمی کا استحصال نہیں ہوگا، سرمایہ داروں کا زرخرید غلام تانا شاہ عوام کے جمہوری حقوق نہیں چھین رہا ہوگا، جس میں سامراجی ممالک تیسری دنیا کے ملکوں پر اپنا قبضہ بنائے رکھنے میں کامیاب نہ ہو پائیں گے اور سامراجی طاقتیں پوری دنیا کو کسی عالمی جنگ میں نہ جھونک پائیں گی۔ سوشلزم کا خواب دیکھنے والے تمام سیاسی اور خیال پرور تنظیمیں اور تخلیق

کاروں کو اسی نجات کی صبح کا انتظار آج بھی ہے۔

بھارت جب آزاد ہوا تو اس آزادی کی صبح نے بیدار شاعروں اور فنکاروں کو اس طرح کی خوشی نہیں دی جو آزادی ان کے اپنے خوابوں میں بسی نجات حاصل ہونے پر ہوتی۔ انھیں اس کا گہرا احساس تھا کہ سیاسی طاقت غیر ملکی سرمایہ داروں کے ہاتھ سے دیسی اجارہ دار گھرانوں کے ہاتھ آ گئی ہے، جس نے بڑے زمینداروں سے معاہدہ کر لیا ہے اور غیر ملکی سرمایہ داروں سے بھی سمجھوتہ کیا ہوا ہے، اس لیے نئے نظام میں بھی سوشن (استحصال) کی تیغ غریبوں پر چلتی رہے گی۔ اردو کے کئی شاعروں نے اپنے اس احساس کو پکارا: فیض بھی بے خوف ہو کر اپنی مشہور نظم 'صبحِ آزادی' میں اس احساس کے ترجمان بن کر ابھرتے ہیں:

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

پاکستان کے حکمران طبقوں نے بار بار فوجی تاناشاہوں کے ذریعے عوام کو ظلم و استحصال کا شکار بنایا: بائیں بازو اور جمہوریت پسند شاعروں و ادیبوں کو بھی طرح طرح کے مصائب سے گزرنا پڑا۔ فیض اور حبیب جالب جیسے مشہور شاعروں کو جیلوں میں بند رہنا پڑا، فہمیدہ ریاض کو بھارت میں پناہ لینی پڑی۔ ان حالات پر نظر ڈالنے سے یہ سمجھ میں آ جاتا ہے کہ فیض کی شاعری میں 'درد'، 'دکھ'، 'غم'، 'تنہائی' جیسے بار بار آنے والے لفظوں کا کیا سماجی تعلق ہے۔ اسی طرح کے ایک سلسلے کا حوالہ ایڈورڈ سعید نے تھیوڈور ایڈورنو کی جلاوطنی کے دوران لکھی ان کی اپنی آپ بیتی "Reflections from a Mutialated Life" (ٹوٹی پھوٹی زندگی کی یادیں) سے دیا ہے:

"دربدری کا شکار دانشور خود کو ایک جنس میں تبدیل ہونے سے انکار کرتا ہے۔"

فیض کے ساتھ بھی یہی ہوتا رہا کہ وہ خود کو ایک جنس (کموڈیٹی) میں تبدیل نہیں ہونے دیتے، تاناشاہوں کو ان سے یہی تو شکایت تھی۔ ایسے ہی حالات تو بھارت میں ایمرجنسی کے دوران رونما ہوئے جب بہت سے دانشوروں نے خود کو جنس یا مٹی کا مادھو بننے سے انکار کر دیا تھا۔

فیض نے اپنے نروسن کا درد جس طرح سہا، وہ بھی ایک مثال ہی ہے، کیونکہ اسے انہوں نے دنیا

بھر کے دکھی، غریب، مظلوموں کے غم کے ساتھ گھلا ملا دیا۔ ایسا ہی مشورہ انہیں رشید جہاں سے ملا تھا جس کا حوالہ فیض نے بی بی سی کو دیے اپنے ایک انٹرویو میں دیا تھا کہ اپنے غموں کے بجائے دنیا بھر کے غریبوں اور محروموں کے غموں کو محسوس کرو اور ان دکھوں کو آواز دو۔ فیض نے پھر وہی کیا۔ اپنی محبوبہ کو بھی کہہ دیا کہ پہلے جیسی محبت کی مانگ پوری کرنا ممکن نہیں۔ یہاں فیض نے اپنے 'خودی' کے وسعت کی بات کہی ہے جس سے * مکتی بودھ نے اپنی کئی کویتاؤں (نظموں) میں بیان کیا تھا۔ اپنے ذاتی درد سے اوپر اٹھنے کی کسرت آسان نہیں ہوتی مگر عظیم شاعری کے لیے وہ ضروری تو ہوتی ہی ہے۔ یہ سلسلہ نقش فریادی کے دوسرے حصے سے ہی شروع ہو گیا تھا اور اس کے بعد کے مجموعوں میں درد کی سماجیت کو ایک حسین انداز کا روپ دے دیا۔

غم کی اس بدلتی رنگت نے ان کی شاعری میں ایک نیا ہی رنگ لا دیا ہے۔ فیض نے دنیا کے مظلوموں کو وہ گیت و ترانے دیے ہیں جو ان کی زبان پر نعرے بن کر جگہ جگہ گونجنے لگے۔ انھیں اپنی منظم طاقت کا احساس کرایا، ظالموں کے ختم ہونے کی امید جگائی، اپنے اظہارِ خیال کی آزادی بنائے رکھنے کا حوصلہ دیا انہوں نے ہی ہمیں سکھایا: 'بول کہ لب آزاد ہیں تیرے'۔ انہوں نے اپنے نرواسن میں اظہارِ خیالات کی جو طرز ایجاد کی ہے وہی ساری جمہوری شاعری کی طرز (شیلی) بن گئی ہے:

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے

دربدری (نرواسن) کے درد کو سہنے اور اسے تخلیق کاری کے جنون میں بھلائے رہنے کے وصف نے فیض میں انقلابی امید کو زندہ رکھا۔ 'مرے دل مرے مسافر' میں شامل 'شاعر لوگ' نظم بتاتی ہے کہ شاعر کو اپنے سے اوپر اٹھنے کے لیے کیا کرنا ہوتا ہے:

جن پہ آنسو بہانے کو کوئی نہ تھا

---

* مکتی بودھ (1917-1964) نے ہندی ادب میں ایک روشن دور کا آغاز کیا۔ ایک شاعر کے روپ میں ترقی پسند تحریک میں ان کا ایک عظیم مقام ہے: اگر ہندی نثر میں پریم چند ہیں تو ہندی نظم میں مکتی بودھ۔ 'آزاد فکر'

اپنی آنکھ ان کے غم میں برستی رہی
سب سے اوجھل ہوئے حکمِ حاکم پہ ہم
قید خانے سہے تازیانے سہے
لوگ سنتے رہے سازِ دل کی صدا
اپنے نغمے سلاخوں سے چھنتے رہے

فیض کی کویتاؤں میں دربدری یا قید سے منسلک تشبیہات و استعارے یا وہ نغمے جو سلاخوں سے چھنتے رہے انہیں ہم خاص طور سے ان کے ان مجموعوں میں فنکارانہ حُسن کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں جو 'دست صبا'، 'زنداں نامہ'، 'دستِ تہہ سنگ' اور 'سروادیِ سینا' سے ہو کر 'شام شہرِ یاراں'، 'مرے دل مرے مسافر'، 'غبارِ ایام' وغیرہ کے نام سے سامنے آئے۔ دربدری کے درد کا احساس یا سرعرفات کو معنون مجموعے 'مرے دل کا مرے مسافر' کی پہلی نظم میں فنکارانہ انداز میں موجود ہے:

مرے دل مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یار نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا

اسی مجموعے کی 'تین آوازیں' نظم کے تین حصے ہیں۔ ایک آواز ظالم کی ہے جس میں طنز اور آئیرنی (irony) کا بے مثال استعمال ہے۔ دوسری آواز مظلوم کی ہے جس میں دنیا بھر کے مظلوموں کا درد چھلکتا ہے۔ تیسری آواز آسمان سے آنے والی آواز 'ندائے غیب' ہے جو مذہبی لے

میں ظاہر ہونے کے باوجود انقلاب کی صدا بن جاتی ہے:

اٹھے گا جب جمع سر فروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہوگا جو بچا لے
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اٹھے گا شور محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

(سمرقند 1979)

بیروت میں قیام کے دوران انہوں نے فلسطینی متحدہ محاذ کے ساتھ اپنی ایکتا و نسبت کا نہ صرف اظہار کیا بلکہ اس کو اپنی شاعری کا موضوع بھی بنایا۔ بیروت میں 1980 میں لکھی 'فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے' اور 'فلسطینی بچے کے لیے لوری' ان کی دو مشہور نظمیں ہیں جس میں ان کے نرواسن کا احساس پورے جذبات کے ساتھ ابھر کر آتا ہے۔ پہلی نظم میں وہ کہتے ہیں:

دور پردیس کی بے مہر گذرگاہوں میں
اجنبی شہر کی بے نام و نشان راہوں میں
جس زمیں پر بھی کھلا میرے لہو کا پرچم
لہلہاتا ہے وہاں ارضِ فلسطین کا علم

اور دوسری نظم جو 'لوری' کے فارم میں لکھی گئی ہے وہ دربدری کا درد کو جھیلتے بچے کو سلانے کے لیے نہیں بلکہ اس کو مسکرانے کے لیے کہتی ہے۔ بچے کے سارے کنبے کے لوگ کہیں دور چلے گئے ہیں اگر وہ روئے گا تو ظالم اُسے اور رلائیں گے اور وہ مسکرائے گا تو اس کے اپنے لوگ بھیس بدل کر واپس آئیں گے۔ شاعر نے عیسیٰ مسیح کی دوبارہ رونمائی کا تشبیہ کے طور پر استعمال کیا ہے:

تو گر روئے گا تو یہ سب
اور بھی تجھ کو رُلوائیں گے
تو مُسکائے گا تو شاید
سارے اِک دن بھیس بدل کر
تجھ سے کھیلنے لوٹ آئیں گے

(بیروت 1980)

مسکراتے ہوئے درد کو برداشت کرنا ان کی شاعری کی تکنیک ہی نہیں، ظالموں کے لیے چنوتی بھی ہے۔ اپنے 'گیت' میں انہوں نے کہا تھا:

اپنے دردوں کا مُکٹ پہن کر
بے دردوں کے سامنے جائیں
جب رونا آوے مسکائیں
جب دل ٹوٹے دیپ جلائیں

کیا المیہ ہے کہ جس شاعر نے اپنے وطن سے بے انتہا محبت کی ہو اُسے غدار کہہ کر تہمتیں لگائی گئیں: فیض کے لیے وطن کا مطلب صرف نقشے پر کھینچی ہوئی لکیریں نہیں تھا، وہ سارے عوام تھے جن سے مل کر کوئی وطن بنتا ہے۔ اگر عوام کے جمہوری حقوق چھین لیے جائیں، ظلم و ستم کے خلاف لب کھولنا جرم بن جائے اور سامراجیت کی شبہہ پر تانا شاہی تھوپ دی جائے تو کوئی بھی سچا حساس شاعر اور ادیب بے چین ہوئے بغیر کیسے رہ سکتا ہے؟

خیال سوئے وطن رواں ہے
سمندروں کی ایال تھامے
ہزار وہم و گماں سنبھالے
کئی طرح کے سوال تھامے

(بیروت 1980)

یہاں 'شوپیں کا نغمہ بجتا ہے' کے یہ مصرعے بھی ظلم کی شدت کے خلاف آزادی کے دیوانوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں:

کچھ آزادی کے متوالے،
جاں کف پہ لیے میداں میں گئے
ہر سو دشمن کا زغہ تھا'
کچھ بچ نکلے کچھ کھیت رہے
عالم میں ان کا شہرہ ہے
شوپیں کا نغمہ بجتا ہے

کچھ نقادوں نے ساختیاتی نظریے سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ان کے معنوں اور ان کے اندرونی رجحانات کو مَسخ (وکرت) بھی کیا ہے۔ ایسے ہی ایک کوشش گوپی چند نارنگ کی مجھے دکھائی پڑی، جنھوں نے فیض کی ایک مشہور نظم 'دستِ تہہ سنگ آمدہ' کی ساختیاتی تشریح کر کے یہ بتایا کہ یہ 'قید خانہ' نظریے کا بھی ہو سکتا ہے جس سے نجات کی کوشش شاعر کر رہا تھا۔ ایسے معنی نکالتے ہوئے انہوں نے ترقی پسند تحریک پر بھی لگے ہاتھ چوٹ کر دی، اور فیض کو علی سردار جعفری کے مقابلے نظریہ کی گرفت سے آزاد یا ہندی - فارسی کی جمالیاتی بیان بازی کا معتقد شاعر کے روپ میں پیش کیا اور یہ بھی فرمایا کہ مارکسی دانشور اس جمالیاتی حسن کو 'بورژوا' کہتے ہیں۔ وہ مانتے ہیں کہ فیض کی کویتا میں خاموشی (مون)، وقفہ (انترال) ہی نظریے کو زیادہ مصنوعی بنانے میں مددگار ہوتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ کو یہ نہیں معلوم کہ نظریہ کو چھپا کر رکھنے کی صلاح فنکاروں کو سب سے پہلے اینگلس نے ہی دی تھی جو مارکسزم کے بنیاد رکھنے والوں میں تھے۔ اپنی شاعری کی روایت ہی نہیں، ماضی (اتیت) کی تہذیب کے روشن اقدار کو ان کے صحیح مقام پر پہنچانے کا واہک (راہبر) محنت کش طبقے کو ہی ہونا ہے اور یہ پیغام لینن نے اور ماؤ نے بھی ترقی پسند فنکاروں اور تہذیب کے کارکنوں کو اپنے اپنے وقت میں دیا تھا، جو آج بھی موزوں ہے۔ اس لیے اگر فیض اپنی کویتاؤں کے لیے ہند۔

فارسی حسن آرائی سے کام لے رہے تھے یا تمام عالم کے بہترین ادب اور آرٹ کی روایت کو آگے بڑھا رہے تھے، اس سے ان کے نظریے کا کوئی بھٹکاؤ (وچلن) نظر نہیں آتا اور نہ کسی مارکسی دانشور نے اس حسن پرور ادب کو 'بورژوا' یا سامنتی (جاگیردارانہ) کہا، یہ تو حضرت نارنگ کی اپنی ہی خام خیالی ہے، بقول فیض:

وہ بات، سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

فیض کے 'زنداں نامہ' میں کویتاؤں سے پہلے سجاد ظہیر کا ایک مختصر تبصرہ اس مجموعے میں شامل ہے، جس میں اس شاعر اور اپنے ہمدم، اپنے دوست اور قید کے ہمنوا ساتھی کی کویتاؤں میں روایت سے لیے گئے جمالیاتی خیالات کی تعریف کی گئی ہے۔ انہوں نے تو اس سمجھ (بودھ) کو 'بورژوا' یا 'سامنتی' (جاگیردارانہ) نہیں کہا جبکہ وہ تو انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھنے والے ادیب تھے۔ انہوں نے لکھا:

"جہاں تک ان اقدار (values) کا تعلق ہے جن کو شاعر نے ان میں پیش کیا ہے وہ تو وہی ہیں جو اس زمانے میں تمام ترقی پسند انسانیت کی اقدار ہیں، لیکن فیض نے ان کو اتنی خوبی سے اپنایا ہے کہ وہ نہ تو ہماری تہذیبی تمدن کی بہترین روایت سے الگ نظر آتی ہیں اور نہ شاعر کی انفرادیت، اس کا نرم، شیریں، اور مترنم اندازِ کلام کہیں بھی ان سے جدا ہوتا ہے۔"

نارنگ جیسے بہت سے نقاد مغرب سے ادھار لی گئی یا چوری کی ہوئی تنقیدی طریقوں کا استعمال اکثر ترقی پسند جمہوری خیالات کی روایت پر حملہ بولنے کے لیے کرتے ہیں اور زیادہ مغز پچی ساختیت پر کرتے ہوئے وہ پڑھنے والوں کو یہ نصیحت دیتے ہیں کہ فیض کو کس طرح نہیں پڑھنا چاہیے، ان کے لکھے کا یہی عنوان (شیر شک) ہے اور کیسے پڑھنا چاہیے اس کے لیے انہوں نے ان کی ایک نظم 'دستِ تہہ سنگ آمدہ' (پتھر کے نیچے دبا ہوا ہاتھ) کی بناوٹ کی تشریح کی ہے۔ یہ بمب (تشبیہ) شاعر نے غالب سے لی ہے۔ غالب کے وقت تو آبادیاتی ایسٹ انڈیا کمپنی کی چٹان کے نیچے فنکار کا

ہاتھ دبا تھا۔ 1857 سے اس وقت کے وحشی دشمن (ظلم) اور تکلیفوں کو غالب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ فیض نے مارشل لاء کی چٹاں کے نیچے دبے ہوئے تخلیقی ہاتھ کو دیکھا۔ انہوں نے ادیبوں کی اظہار خیال کی آزادی پر لگی پابندی ہی نہیں، دنیا کے کئی دیشوں پر سامراجی دشمن کی بربریت کو بھی دیکھا اور تمام محروموں، وطن بدر کیے گئے عوام اور جلاوطنی میں جی رہے انسانوں کا درد بھی تلخی سے محسوس کیا تھا۔ لوڈملا ویسلیوا کی فیض پر لکھی کتاب کا ریویو کرتے ہوئے ادیب خالد نے اس بات کو ابھارا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ فیض صاحب نے 1982 کے ایک بیان میں خود یہ کہا تھا:

> ''ایک مصنف کی حیثیت سے حالانکہ میں کسی ملک کا کام کاج نہیں سنبھالتا ہوں اور نہ ہی میرے پاس ناظمی طاقت ہے، مجھے یہ احساس کرنے کا حق ضرور ہے کہ میں اپنے بھائی بندھوں کا سرپرست ہوں اور میرے بھائی بندھو پوری دنیا کے عوام ہیں۔ میرے تئیں امن، آزادی، جنگ بندی اور ایٹمی دوڑ کی مخالفت ہی موضوع ہے۔ اس وسیع بھائی چارے میں سے میرے اور میرے دل کے نزدیک وہ عوام ہیں جو بے عزت نکالے ہوئے اور محروم ہیں، جو غریب، بھوکے اور پریشان ہیں۔ اسی وجہ سے میرا لگاؤ فلسطین، جنوبی افریقہ، نامیبیا، چلّی کے عوام اور اپنے ملک کے عوام اور مجھ جیسے لوگوں سے ہے۔''

جس طرح فیض خود نرواسن (دربدری) کا درد جھیل رہے تھے، اسی طرح وطن بدر ہوئے لاتعداد فلسطینی عوام اور دنیا کے کئی ملکوں میں دمن اور تکلیف کے شکار بھولے بھالے لوگ اُن کے قدرتی طور پر ہمراہی تھے۔ ان کا درد بھی وہ اپنی شاعری میں بیان کر رہے تھے، کہیں کہیں وہ درد سیدھے سیدھے کہا گیا ہے تو کہیں کہیں وہ اشاروں اور علامتوں کے ذریعہ سے آیا ہے۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ پست ہمتی نہیں دکھاتے، ایک اُمید ہر جگہ جگا دیتے ہیں، ظلم و ستم کے اندھیرے چھٹیں گے اور بہتر مستقبل کی صبح آئے گی۔

'دستِ تہہ سنگ' کی نظمیں وطن سے دربدر ہونے سے پہلے کی ہیں مگر ان میں بھی ان کی قید میں

ملی زندگی کے درد کی آرٹسٹک تخلیق دیکھی جا سکتی ہے۔ افسوس حضرت نارنگ کو فیض کی شاعری میں زبان کے فن کا پیراڈوکس (paradox) نظر نہیں آتا مگر وہ آئیڈیولوجی (Ideology) کی زنجیر کو دیکھ لیتے ہیں۔ کچھ تو اِدھر بھی دیکھیے، فیض کی نظم کے پہلے دو مصرعے اس درد یعنی نرواسن (دربدری) کے درد کا اظہار کرتے ہیں مگر ان کے بعد دو مصرعے اسی پیراڈوکس کو شکل دے دیتے ہیں:

بیزار فضا درپئے آزار صبا ہے
یوں ہے کہ ہر اک ہمدمِ دیرینہ خفا ہے
ہاں بادہ کشو آیا ہے اب رنگ پہ موسم
اب سیر کے قابل روشِ آب و ہوا ہے

گوپی چند نارنگ اس پوری نظم کا ایک ساختیاتی سبق کے طور پر پیش کرنے کا دم بھرتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ 'یہ کویتا' نہ تو پریم کویتا ہے اور نہ سیاسی کویتا۔' مگر جب اس نظم کے میٹافر کی تشریح کرنے لگتے ہیں تو ان کے ساجک۔ سیاسی پہلو ہی اجاگر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس پوری نظم میں 'الزام کی برسات، زہر ہلال، ظلم، زنجیر، سزا، ہتھکڑیاں' اور آخر میں غالب سے لیے ہوئے 'گرفتاری اور پتھر کے نیچے دبا ہاتھ' کیا سیاسی شعور کے بغیر تشریح کے حامل ہو سکتے ہیں جس کی وجہ سے شاعر آخری دنوں تک اپنے نرواسن میں اپنے ارضِ وطن سے کہتا رہا:

ہم تو مجبور وفا ہیں مگر اے جانِ جہاں
اپنے عشاق سے ایسے بھی کوئی کرتا ہے
تیری محفل کو خدا رکھے ابد تک قائم
ہم تو مہماں ہیں گھڑی بھر کے ہمارا کیا ہے

ایک ایسے شاعر کی ساختیاتی تشریح کر کے اس معانی کو مسخ کر دینا اس کے نظریے کی مخالفت کرنے والوں کا پرانا راگ ہے۔ جو اپنے وطن اور دنیا کی عوامی طاقت کو محبوبہ کی طرح دیکھتا ہے جس کی آزادی کے لیے تڑپتا ہے اور زندگی کے آخری لمحے تک اپنے نظریے سے ڈانواں ڈول نہیں ہوتا۔

ساختیاتی معتقدوں کا جپ کرنے سے یا التھوسر اور رولاں بارتھ کی تسبیح پھیرنے سے ساختیاتی تشریح بھی نہیں ہوتی اور کی جائے گی تو نہایت پھوہڑ قسم کی ہی ہوگی۔

کچھ حضرات نے فیض کے بارے میں یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ مارکسزم (مارکسواد) کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے تھے اور ان کا اس نظریے پر اعتماد کمزور تر ہوتا جا رہا تھا، سوویت نظام سے یقین اٹھ رہا تھا! یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ نومبر 1984 میں فیض نے اس دنیا کو الوداع کہہ دیا تھا اور یہ حقیقت بھی عیاں ہے کہ سوویت یونین کا بکھراؤ کافی بعد میں ہوا۔ اس طرح کی باتیں بغیر سر و پا ہیں، فیض ڈگمگائے نہیں۔ جئے بھی صداقت کے ساتھ اور گئے بھی تو گنگناتے ہوئے:

اُدھر بھی دیکھو
جو حرفِ حق کی صلیب پر اپنا تن سجا کر
جہاں سے رخصت ہوئے
اور اہلِ جہاں میں اس وقت تک نبی ہیں

فیض کی شاعری کی یہی تو خوبی ہے کہ وہ عشق، وطن سے محبت، اپنے انقلابی نظریے اور دنیا کے محنت کشوں، محروموں و مظلوموں کے ساتھ ہمدردی اور اپنے نرواسن (دربدری) کے درد کو اس طرح اپنی شاعری میں گھلا ملا دیتے ہیں کہ اس میں حقیقت کی بہت ساری پرتیں فنکاری کی نئی جھلک دیتی ہیں:

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گذرنے والے
ناصحو، پند گرو راہ گذر تو دیکھو

فیض کے نظریے کے مخالف بھی ان کی اس فنکارانہ امتزاج پر فدا ہیں اور انہیں اپنی گھٹیا تنقید کا شکار نہیں بنا پاتے۔ ہم لوگوں کا پیارا یہ شاعر اردو میں ہی نہیں، پوری دنیا کے ادب میں ہمیشہ ہمیشہ ایک چمکتا آفتاب رہے گا۔

اظہارِ عقیدت اور وقت کی کیفیت

اسد زیدی

1941 میں شائع اپنے پہلے مجموعہ کا نام فیض نے نقشِ فریادی رکھا۔ یہ دیوانِ غالب کے پہلے دو شبد ہیں۔ قریب ایک چوتھائی صدی بعد سن 1965 میں اپنے چوتھے مجموعہ کا نام پھر انہوں نے غالب ہی سے لیا۔ دستِ تہِ سنگ (پتھر کے نیچے دبا ہاتھ)۔ یہ کوئی اتفاق نہیں تھا۔ پرانی روایت ہے کہ دیوان کی شروعات حمد سے ہو: نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا۔ غالب پہلے ہی شعر میں ایسی کیفیت سامنے رکھ دیتے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا وہ شرارت بھرے انداز میں خود تعظیم کر رہے ہیں، یا اللہ کی تعریف۔ اب ذرا دستِ تہہ سنگ کو دیکھیں: 'مجبوری و دعوائے گرفتاریِ الفت / دستِ تہہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے۔' ہاتھ ایک بھاری پتھر کے نیچے دبا ہوا ہے، اور ہم کہہ رہے ہیں کہ روزِ قیامت تک تمہارے پیار کے قیدی رہنے کی قسم کھائے ہوئے ہیں۔

☆

فیض نے اپنی ساری زندگی غالب کے سائے میں گزاری۔ وہ جب بھی اپنے سے تھک جاتے ہیں تو غالب کی زمین پر لوٹ آتے ہیں۔ ان کی طبیعت اور مزاج غالب سے الگ ہیں: غالب کی ظرافت، وڈمبنا بودھ (پر تضاد نقطۂ نظر)، کڑواہٹ، خود پر ہنسنے کی عادت اور بے نیازی فیض کے

یہاں کم ہی نظر آتی ہے۔ پر غالب کے بنا ان کو اپنی اسمتا (پہچان) خطرے میں لگتی ہے۔ بغیر غالب کو یاد کیے وہ غزل تو لکھ نہیں سکتے۔ اپنی آخری غزل میں بھی فیض بالکل استاد کے پہلو میں بیٹھے دکھائی دیتے ہیں:

ہم ایک عمر سے واقف ہیں اب نہ سمجھاؤ
کہ لطف کیا ہے، میرے مہرباں ستم کیا ہے
کرے نہ جگ میں الاؤ تو شعر کس مقصد
کرے نہ شہر میں جل تھل تو چشم نم کیا ہے
ازل کے ہاتھ کوئی آ رہا ہے پروانہ
نہ جانے آج کی فہرست میں رقم کیا ہے

مولانا الطاف حسین حالی کے بعد غالب کی مرکزیت کو پہچاننے اور پھر اسے کویتا میں لازم کرنے کی ذمہ داری جن لوگوں نے اٹھائی ان میں فیض احمد فیض پیش پیش ہیں۔ حالانکہ جتنا دھیان اس بات پر دیا جانا چاہیے دیا نہیں گیا ہے۔

☆

اقبال کے انتقال کے وقت فیض 27 سال کے تھے اور اقبال کا اثر پنجاب اور شمال مغربی ہندوستان میں ویسا ہی تھا جیسا بنگال میں رویندر ناتھ ٹیگور کا۔ اقبال کی طرح فیض کی پیدائش بھی سیالکوٹ ہی کی ہے۔ فیض اقبال کے دبدبے اور مار سے کیسے بچے رہ سکے یہ بھی ایک غور طلب چیز ہے۔ فیض نے خود اقبال کی شخصیت سے انکار نہیں کیا، اور ان کو عقیدت پیش کرتے ہوئے دو نظمیں بھی لکھیں، لیکن 'اقبالیت' کے جنون سے خود دور رہے۔ فیض کے تاثرات کی عظمت اور اردو شاعری کی ترقی میں ان کے تاریخی کردار کی چابی شاید یہیں پر ہے۔ فیض نے اردو شاعری کے روایتی ساز و سامان اور طریقۂ کار کو پھر سے سنبھالا، اقبال کے دور میں جو عمارتی ٹوٹ پھوٹ ہوئی اس کی مرمت کی اور بڑے اطمینان سے اسی پرانی بنیاد پر پھر سے وہی در و دیوار کھڑے کیے۔ انہوں نے نئے سے پرانے کا کام لینے کے بجائے پرانے

سے نئے کا کام لیا۔ انہوں نے اردو شاعری کو اقبال کے دیرینہ فلسفے اور نئی آزاد خیالی سے بچایا۔ نتیجے کے رنگ سے رنگی اقبالیت کو سیدھی چنوتی دینے کے بجائے اردو کی روایتی ترقی پسند، نان کنفرمزم اور غالبًا ماڈرن کی راہ پکڑی۔ فیض نے اپنی مثال سے ثابت کیا کہ شاعری میں غالب کی روایت ہی میں آگے کا راستہ ہے۔ بعد کے اقبال کا راستہ ایک اندھی گلی ہے۔ علامہ اقبال کو صفائی اور خود اعتمادی کے ساتھ بائی پاس کرنا فیض کے بڑے کارناموں میں شمار کیا جانا چاہیے۔

☆

قومیت ماڈرن تواریخ کی ایک مرکزی چلانے والی طاقت رہی ہے۔ خاص کر ان ملکوں میں جو مغرب کے نوآبادیاتی رہے۔ ہندوستان جیسے ملکوں میں قومیت نے لازمی سامراج وادمخالف بیداری کا رول ادا کیا۔ لیکن قومی بیداری ہر قومی بیماری کا علاج نہیں ہے اس بات کو فیض سے پہلے پریم چند اور اقبال نے، اور ان سے پہلے رویندر ناتھ ٹیگور نے دیکھ لیا تھا۔ قومیت کئی رنگوں میں اور کئی ناموں سے آتی ہے اور اس کے مختلف پہلو ایسے ہیں جو سدھار (ریفارم) کے نام پر اور پرانے سماجوں میں چلی آ رہی اور دو ڈھائی ہزار سالوں میں پھیلی مانو وادی (انسان نواز) روایتوں اور اتحاد کو تباہ بھی کر سکتی ہے فیض نے اس چیز کو پہچانا اور اپنی کویتا میں عالم گیر انسانی روایتوں اور احتجاج کی عوامی روایتوں کو بنیاد (base) بنایا۔ انہوں نے عوامی زندگی میں رچی بسی روحانی نجات دہندہ روایات (صوفی اور غیر صوفی) کے ساتھ ہمدردی کا رشتہ بنایا اور ان کے سہارے status quoism کے خلاف اور انصاف پر مبنی سماج کی تعمیر کو اپنے یوٹوپیا* (utopia) کا حصہ بنایا۔ فیض ہمیشہ یوٹوپیا پر بل دیتے ہیں۔ سیاسی نظام اور اقتدار کے ڈھانچے بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ لیکن یوٹوپیا کبھی ختم نہیں ہوتے، بنیادی قدروں کے لیے انسان کی لڑائی جاری رہتی ہے۔ ان کی شاعری میں وطن کا پیار جھلکتا ہے لیکن کہیں بھی 'پربت وہ سب سے اونچا' جیسی 'جارحانہ' بانگ نہیں ہے۔ دوسری طرف وہ قومی درد

---

* یوٹوپیا کو اسد زیدی نے امید افزا خیال یا حقیقت میں تبدیل ہونے والا خواب کے روپ میں استعمال کیا ہے، جہاں زندگی الجھ کر نہیں رہ جاتی بلکہ ایک بامعنی منزل کی طرف چل نکلتی ہے۔

کے نمائندہ شاعر ہیں: 'نثار میں تیری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں / چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے' یا 'کہ یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر'۔

☆

دنیا میں قید کی زندگی اور زنداں یا وطن بدری کے فیض جیسے شاعر کم ہی ہوئے ہیں۔ اس طرح کے دو شاعروں، ناظم حکمت اور محمود درویش، سے اکثر ان کا موازنہ کیا جاتا ہے۔ فیض سے ان دونوں کی دوستی بھی تھی اور ناظم حکمت کا تو انہوں نے ترجمہ بھی کیا تھا۔ قید اور زنداں پر ان سبھی کا کام لگتا ہے ایک بہت لمبی، بہو بھاشی (کئی زبانوں پر مبنی) عالمی شاعری کا حصہ ہے۔

☆

'نثار میں تیری گلیوں پہ اے وطن......' میں فیض اپنے نمائندہ روپ میں موجود ہیں:

بہت ہیں ظلم کے دستِ بہانا جو کے لیے
جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
تیرے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں
غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایہ دیوار و در میں جیتے ہیں
یوں ہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی
یوں ہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

یہاں شاعر کی اپنے وطن کے لوگوں سے محبت اور حب الوطنی کے نام پر وطن پر قابض ظالمانہ طبقوں سے نفرت ایک ساتھ موجود ہے۔ اس کا یہ انداز اسے بیسویں صدی کی شاعری کی مشہور باغی آوازوں کی اس صف میں کھڑا کر دیتا ہے جس میں بلوک، لورکا، ناظم حکمت، نیرودا، بریخت، پاسولینی، محمود درویش، میگیل ارنانڈیز اور ارنیستو کاردینال موجود ہیں۔ ان آوازوں میں اداسی اور امید کے تضادوں کے لگاتار، مستقل احتجاج ہے۔

فیض شکست کے بعد کی پستی اور خاموشی کو بھی انتظار کے ایک وقفہ، احتجاج کی ایک شکل اور کبھی نہ ختم ہونے والے لگاتار انتظار کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ یہ بات اردو نظم کے لباس میں اور ہجر و وصال، قفس اور صیاد، شام و سحر، بہار و خزاں کے استعاروں میں نکھر کر آتی ہے تو سننے والے کو اس سے ایسی تسلی اور طاقت ملتی ہے جو اقبال کی پرزور غیرت کو للکارتی آواز میں نہیں ملتی۔ فیض کہتے نظر آتے ہیں: لڑائی بری نہیں تھی، اور شکست بھی بری نہیں ہے۔ وہ ناامیدی کی گود سے امید اٹھا لاتے ہیں۔ جیسا غالب کہتے ہیں: 'وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے'۔

وہ ماضی کو دھتکارتے نہیں، اسے گلشن کے کاروبار کا حصہ مانتے ہیں۔ یہ کون سا کاروبار ہے، اور کس کا انتظار ہے؟ بیسویں صدی کے وسط تک آتے آتے فیض اردو غزل اور نظم کے باہری روپ، دی اوزان، مرکزی جمالیاتی استعاروں اور ترکیبوں کو چھیڑے بغیر ایک اندرونی انقلاب بپا دیتے ہیں۔ وہ اردو شاعری کے پرانے سامعین کو کھوئے بغیر محبت اور ہجر کے شاعر نہیں رہتے، ان کا معشوق کوئی انسانی یا روحانی شے نہیں رہتا، ان کا گلشن کوئی گلشن نہیں رہتا۔ وہ اپنی شاعری کو سماجی کرانتی، انصاف اور آزادی کی مستقل تشویش اور امید کی شاعری بنا دیتے ہیں، اور سطحی عشقیہ شاعری کا راستہ لگ بھگ بند کر دیتے ہیں۔ ان کا عاشق حسبِ معمول کوئے یار سے نکل کر سوئے دار کی طرف

جاتا ہے، لیکن اس آمد و رفت کے معنی مکمل طور پر بدل چکے ہیں۔ وہ صوفیانہ مضمون کے دھاگوں سے سماجی اور سیاسی انقلاب کا نیا بھرم بن دیتے ہیں، اور یہ بھرم اردو میں جدیدیت اور ماڈرن دور کے شور، ڈھول اور دھوؤں کے بیچ اپنی نئی جگہ یا چمک نہیں کھوتا۔ بائیں بازو کے مخالف گروپ بھی فیض سے ادب سے ہی مخاطب ہوتے ہیں، لیکن فریادیوں والا 'کاغذی پیراہن' پہن کر۔

اس طرح فیض بیسویں صدی میں غزل کو پھر سے (اور اس کے ساتھ نظم کے طرزِ اسلوب کو) ایک ایسی جگہ پر گامزن کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں جہاں بدلتے دور کے تقاضوں سے وہ ہمکنار ہے۔ غزل اٹھارہویں اور انیسویں صدی کا ایک اہم ذریعہ خیالات رہی۔ انیسویں صدی غالب کی صدی تھی پر اسے بیسویں صدی میں جلائے رکھنے میں بھی غالب کے پرستاروں کا ہی حصہ (یوگ دان) سب سے زیادہ ہے۔ ان لوگوں میں فیض سب سے آگے ہیں۔ فیض کی شاعری غالب سے اظہارِ عقیدت اور جرح بھری ہوئی ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے کام پڑتا ہے۔

☆

فیض اپنے 'استاذ' کے ساتھ شطرنج کھیلنا نہیں بھولتے۔ بلکہ یہ بھی ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ غالب کہتے ہیں:

بلبل کے کاروبار پہ ہے خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جسے عشق خلل ہے دماغ کا

فیض کی بازی کچھ اور ہے:

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

ایسی مثالیں بے شمار ہیں۔

فیض غالب کے مضمون پر اس طرح کام کرتے ہیں اور اس میں ایسی صورتیں نکالتے رہتے ہیں جیسی کہ صورت مکلوش یانچو نے الیکٹرا کے یونانی متھک پر کام کرتے ہوئے اپنی امر فلم 'الیکٹرا مائی لو'

(الیکٹرا، میری محبت) میں نکالی تھی۔

☆

اردو میں یہ بات رہی ہے کہ غزل کے سامعین اور قارئین ہمیشہ دورِ حاضر کے شاعروں پر ہی توجہ دیتے رہے ہیں، پرانوں کی طرف ان کا خیال زیادہ نہیں رہتا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہوگی کہ غزل پرفارمنگ ٹریڈیشن کی طرح زیادہ محبوب رہی۔ مثلاً ذوق، غالب اور مومن کے دور میں ان کی دھوم تھی۔ لکھنؤ میں انیس و دبیر کا شہرہ تھا، پھر داغ کی دھوم ہوئی، ایک دور اقبال کا آیا، جگر اور حسرت اور فراق کا زمانہ آیا۔ ایک میر ہی تھے جنہیں ہر دور میں یاد کیا گیا۔ غرض یہ کہ ترقی پسند تحریک کے زمانے میں ہی یہ ممکن ہو پایا کہ غالب یا میر یا نظیر کو پرانوں کی طرح دیکھنے کے بجائے منسلک ہم عصروں کی طرح دیکھا جائے اور ان سے سیدھی بات چیت کی جائے۔

فیض کو اپنے ابتدائی دور میں غالب کی شدید ضرورت پڑی اور یہ رشتہ زندگی بھر چلا۔ فیض کے یہاں میر تقریباً غائب ہیں۔ صرف 1954 میں جب فیض منٹ گومری جیل میں قید تھے انہیں کچھ میر کی یاد آئی۔ دو ہی غزلیں ایسی ہیں جہاں میر کی صحبت جھلکتی ہے۔ ('کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں'، اور 'کچھ محتسبوں کی خلوت میں کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے'۔) میر کی طرف اقبال نے بھی کم ہی دیکھا تھا اور غور کریں تو 1947 سے پہلے صوبہ پنجاب میں میر کی زیادہ پوچھ نہیں رہی۔ برِ اعظم کی تقسیم کے بعد سب کو میر یاد آئے اور بری طرح چھا گئے۔ ناصر کاظمی اور ابنِ انشا جیسے دو الگ الگ مزاج کے شاعر میر کی ہی مجلس میں رہے۔

اردو جیسی بھی بد قسمت زبان ہو اُسے زندہ رکھنے میں پرانے بڑے مددگار رہتے ہیں۔ وہ اپنی ہمعصری کھونے نہیں دیتے۔ آج فیض بھی انہیں پرانوں میں شامل ہیں۔

☆

اردو شاعری میں نسوانی آواز کے لیے جگہ بنانے اور اسے قائم کرنے میں ترقی پسندوں کا، ان میں بھی سب سے زیادہ فیض کا رول ہے، اس میں مجھے کوئی شک نہیں ہے۔ اس کے لیے فیض نے

الگ سے کچھ نہیں کیا، ان کی صرف حاضری سے ہی یہ راہ کھل گئی۔ فیض نے روایت کو جو خاموش لیکن بنیادی ماڈرن روپ دیا اسی میں آوازوں کی ایک حقیقی اور جمہوری وسعت کے طور پر اور ساتھ رہنے کی زمین موجود تھی۔ غزل اور نظم میں شاعرائیں پتہ نہیں کب سے تقریباً مردانے لباس میں مردانی بولی بولتے ہوئے پیش ہوتی رہی ہیں! جیسے پرانے ناٹکوں میں، جہاں عورتوں کے کردار مرد ہی نبھایا کرتے تھے، شاعری میں بھی 'نسوانی آواز' پر شاعر کا ہی حق تھا، شاعرہ کے لیے وہ ممنوع ہی تھا۔ ہند فارسی شاعری روایت کا یہ ایک پرانا مسئلہ ہے اور تصوف کی کچھ 'خوبیوں' میں ایک یہ خوبی غور کرنے لائق ہے۔ نثری ادب میں بھلے ہی رشید جہاں، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور انیس قدوائی جیسے مصنفین کے لیے یہ سمسیا (problem) نہیں رہی ہو، پر شاعری کا راستہ پکڑنے والی عورت کی بڑی مشکل رہی ہے۔ کچھ کچھ حالی کے دور سے، پر خاص طور پر فیض کی آمد کے بعد سے یہ ممکن ہو سکا کہ اردو شاعری میں عورت عورت کی طرح پیش ہونے لگی اور شاعرات فرسٹ پرسن کا بے دھڑک استعمال کرنے لگیں۔ یہی وجہ ہوگی کہ آج کی شاعرات کو پڑھتے ہوئے فیض اور مجاز تو یاد آتے ہیں، ن۔م۔ راشد، میراجی، احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی اور اختر الایمان یاد نہیں آتے، جوش و فراق کی تو بات ہی چھوڑیے۔

☆

فیض جیسی مستحکم اور فطری بین الاقوامیت آج اردو شاعری میں درلبھ (عنقا) ہے۔ ہندی میں مکتی بودھ اور شمشیر کو چھوڑ دیں تو وہ کم ہی کم تھی اور یہ بھی اسی پیڑھی کے نمائندے ہیں۔ آج کے شاعر کی آفاقیت نسبتاً غیر مستحکم، معمولی اور ہلکی معلوم ہوتی ہے۔ وہ اکثر ترقی پسند بین الاقوامی اور عصری دور کے عالمی رجعت پسندی (conservative globalization) کے درمیان تمیز کرنا بھول جاتا ہے۔ یہ آفاقیت کم، آفاقیت کا دعویٰ زیادہ ہے۔ اصل میں یہ اپنے یہاں کی حقیقت سے فرار کی ہی ایک شکل ہے۔

یہیں یہ خیال بھی آتا ہے کہ گردشِ دوراں میں پھنسے نسبتاً چھوٹے ملکوں کا آدمی ہی سب سے

زیادہ بین الاقوامی ہو سکتا ہے۔ اسے عالمگیری نظر، اس میں اپنے سماج کی لوکیشن (جگہ) اور سماجی سیاسی بدحالی سے ان چیزوں کے تعلق کا تیز احساس ہوتا ہے۔ اس کے لیے دیش کا بدل بیرونی ملک نہیں ہو سکتا۔ جو بیرونی ہے وہی اندرونی کو متاثر کرتا ہے۔ ہندوستان جیسے بڑے ملک میں سچا بین الاقوامی ہونا اس لیے مشکل اور چیلنج بھرا ہے کہ دیش ہی پوری دنیا نظر آتا ہے۔ اندرونی کا اتنا پھیلاؤ ہے کہ بیرونی بہت دور کی چیز لگتی ہے۔ ہندوستان سے باہر جو ہے بیرون ملک ہے۔ پاکستان یا کیوبا یا افغانستان کے باہر جو بھی ہے نہ صرف بہت پاس ہے بلکہ بری طرح غالب ہے۔ ایک اچھا پاکستان دانشور صرف پاکستان یا پاکستانی تقدیر کے بارے میں سوچتا نہیں رہ سکتا۔ اروگوے، چیلے، ارجنٹینا، پیرو یا نکاراگوا کے ادیب اپنے اپنے دیشوں سے کہیں زیادہ پورے لاطینی امریکی لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہی بات وہاں کے انقلابیوں پر عاید ہوتی ہے۔ تقریباً یہی بات عرب دنیا کے بارے میں صحیح ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پاکستان نے پہلے پچاس سال میں اقبال احمد، حمزہ علوی، طارق علی اور فیض جیسی عالمی شخصیتیں پیدا کیں (بھلے ہی پاکستان کی سطوت کے ایوانوں میں ان کی کوئی قدر نہ ہو) پر ہمارے پاس بتانے کے لیے مشکل سے امرتیہ سین جیسا نام ہے۔

☆

فیض کے بعد: فیض کے بعد گلشن کا کاروبار کتنا بدل گیا ہے۔ بعد کا دور جنوب ایشیا میں جنگ، گھریلو جنگ، فرقہ وارانہ تشدد، مذہبی کٹرپن، سامراجی لوٹ، سماج اور معاشی نظام حملوں اور عام آزادی کے پیچھے ہٹنے کا دور ہے۔ حکومت (ریاست) کے ذریعہ ہر طرح کے احتجاج کا دمن (کچلنا)، عوامی دائرے پر نجی پونجی کا کنٹرول ہمارے دور کی سچائیاں ہیں۔ پاکستان کا حال ہندوستان سے بھی خراب ہوا ہے۔ وہاں جلدی سدھار (ریفارم) کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ فیض کے بعد پاکستان کے
ر اور ادیب آج حد سے حد ہندوستان جیسی 'جمہوریت' اور ہندوستان جیسی 'آزادی' چاہتے ہیں—
، کے جانشینوں کے خواب اب بہت چھوٹے ہیں۔ فیض کی وراثت بس بھارت۔ پاک صلح، شہری

سرکاراور حقوق نسواں کی مہم یا تحریک میں کام آتی ہے۔ پاکستان میں مساواتی سماج کی تشکیل کا کوئی ذکر نہیں جس سے فیض کی شاعری اتنی متاثر تھی، جس کی وجہ سے فیض نے کئی سال جیل میں اور کئی سال دربدری میں گزارے۔

☆

فیض کے یہاں اسلام کی ابتدائی تواریخ اور قرآنی آیتوں کی دھیمی گونجیں ملتی ہیں۔ وہ ان 'اسلامی' حوالوں کا ہمیشہ بامقصد، سیکولر اور پارردرشی (transparent) استعمال کرتے ہیں۔ ان کی آواز فقہ میں رنگی، مذہب پر مبنی دقیانوسی میں بھیگی ہوئی کانپتی ہوئی آواز نہیں ہے۔ وہ کسی مذہبی ملائیت کی چاشنی میں ڈوبے ہوئے شاعر نہیں ہیں۔ وہ نہ ہندی کے ان ترقی پسندوں کی طرح ہیں جن کی دو یا تین پیڑھیاں ایسی تلسی کے رنگ میں ان فرسودہ روایات سے رنگی ہیں کہ کوئی اور رنگ ان پر چڑھتا ہی نہیں، نہ وہ اردو کے ان جدیدیوں کی طرح ہیں جو جوانی میں نراج (انارکی) کی حدوں سے گزر کر اب تسبیح ہاتھ میں لیے رہتے ہیں۔ ان کی مشہور نظم 'ہم دیکھیں گے' تقریباً پوری کی پوری قرآن، تصوف، اور اسلام کے کچھ تاریخی حوالوں پر ٹکی ہوئی ہے، لیکن اس کا کسی بھی طرح کا مذہبی طور پر غلط استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے وہ جنرل ضیاء الحق کے فوجی شاسن کے خلاف پاکستان میں عوامی بغاوت کا مخصوص نشان بنتی ہے پھر اقبال بانو کی آواز میں ایک انقلابی ترانے کا روپ لے لیتی ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب بھی مذہبی رجعت پسند تو ضیاء کی سرکار کی کھلی حمایت کرتے تھے۔

قرآن میں قہرِ خداوندی کی پیشن گوئی اور الٰہی غیض و غضب یہاں سماجی انقلاب کا عظیم یوٹوپین کی آواز بن جاتی ہے۔ 'وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے/ جو ظلم و ستم کے بھاری پہاڑ' روئی کی طرح' اڑ جائیں گے، جب 'تخت و تاج اچھالے جائیں گے، جب حکمرانوں کے' پاؤں تلے یہ دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی، جب 'انا الحق' کا نعرہ بلند ہوگا، جب 'خلقِ خدا' راج کرے گی، 'جو تم بھی ہو اور میں بھی ہوں'۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ کون سا دقیانوسی اسلامی ادارہ اس نظم کو اپنے کورس میں داخل کرے گا، کون واعظ اسے اپنے وعظ کا حصہ بنائے گا! کیا یہ کبھی جمعہ کے روز کسی مسجد کے منبر سے

پڑھی جائے گی؟ ابھی تک تو ایسا ہوا نہیں ہے، اور مجھے نہیں لگتا کہ ایسا کبھی ہوگا؟ اور اگر ایسا ہو گیا تو مجھے سب سے زیادہ خوشی ہوگی۔ اس پر کبھی غور نہیں کیا گیا کہ فیض تصوف کو اسلامی روایت کے رنگ میں دیکھتے ہیں، اس کی مخالفت میں جو بات اسلام کے ضمن سے نہیں کہی جا سکتی ہے، وہ تصوف کے ضمن سے بہت کامیابی سے کہی جا سکتی ہے، ایسا فیض نہیں سمجھتے۔ ان کے لیے صوفی مت (مسلک) اسلام کا وکلپ (متبادل) نہیں ہے۔ اوّل تو فیض کے یہاں تصوف بھی کوئی وکلپ نہیں ہے۔ وہ ان کے لیے نظریہ یا زندگی کا شعور نہیں بن سکتا۔ تصوف ان کے لیے حاصل محاورہ اور زبان ہے، جیسے وہ غالب کے لیے بھی تھا۔ فیض اتنے ہی روحانی ہیں جتنے محمود درویش یا اڈورڈ سعید۔

فیض کی اشتراکی شاعری

ڈاکٹر عزیزہ بانو

اردو ادب میں فیض احمد فیض کی شخصیت اور ان کی شاعری کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ فیض نے جس دور میں شاعری کی ابتدا کی اس زمانے میں جوشؔ اور حفیظؔ اردو شاعری پر چھائے ہوئے تھے۔ اپنے طالب علمی کے زمانے میں ان اساتذہ کے کلام کے گہرائی سے مطالعے نے اس نوجوان شاعر کے ذہن پر ایسا اثر ڈالا کہ یہ شاعر ابتدا میں رومانی شاعر کی حیثیت سے منظرِ عام پر آیا۔ فیض کی نظمیں اور غزلیں ان کی ذات میں چھپے جذباتی طوفان کا پتا دیتی ہیں۔

فیض کے ذہن کے کسی گوشے میں انسان اور انسانیت کا درد ابتدا سے موجود تھا۔ 'نقشِ فریادی' کا پہلا قطعہ اس طرف اشارہ کرتا ہے جس میں وہ پیار کے قرار آجانے کی بات کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی 'خدا وہ وقت نہ لائے' اور 'سرودِ شبانہ' میں فیض محبوب کے انتظار میں بیقرار رہتے ہیں اور محبوب سے پیار کرنے اور زندگی کو خوشنما بنانے کا خواب دیکھتے ہیں، حالاں کہ اس عہد کی نظموں اور غزلوں میں انسانی دردمندی کا احساس بھی ملتا ہے، لیکن شاعری پر رومانی غبار بھی چھایا رہتا ہے۔ 'انتظار' 'تہِ نجوم' 'انجام' وغیرہ نظمیں اس کی بہترین مثال ہیں۔

۳۵-۱۹۳۴ء میں عالمی سطح پر تیزی سے بدلتے ہوئے ماحول نے ان کی فکر کو ایک نئے رخ سے

ہمکنار کیا اور فیض کی شاعری میں ذکرِ محبوب کے ساتھ ساتھ اشتراکی نظریات اور عوام دوستی جیسے خیالات بھی جگہ پانے لگتے ہیں۔ 'نقشِ فریادی' کے پہلے حصے کی آخری دو نظمیں 'یاس' اور 'مرے ندیم' فیض کے بدلتے ہوئے رجحان کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ حالاں کہ ان نظموں میں بھی رومانی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے اور فیض اشتراکی خیالات و نظریات سے قریب ہوتے ہوئے بھی محبوب کو بھلا نہیں پاتے ہیں:

مچل رہا ہے رگِ زندگی میں خونِ بہار
الجھ رہے ہیں پرانے غموں سے روح کے تار
چلو کہ چل کے چراغاں کریں دیارِ حبیب
ہیں انتظار میں اگلی محبتوں کے مزار
محبتیں جو فنا ہو گئی ہیں میرے ندیم!

لیکن ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستگی، کارل مارکس کی تحریروں کا گہرائی سے مطالعہ اور صاحبزادہ محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں کی عالمانہ صحبتوں نے فیض پر ایسا اثر ڈالا کہ ان کے شعری رجحان میں ایک نمایاں تبدیلی رونما ہونے لگی۔ خیالات و نظریات نے ایک نیا رخ اختیار کیا اور 'مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ' تخلیق ہوئی، چنانچہ عشق میں ڈوبا ہوا شاعر پکار اٹھتا ہے۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

یوں فیض کی شاعری کا ایک نیا عہد شروع ہوتا ہے جس میں ان کے فکر و خیال پر سماج اور سیاست حاوی ہو جاتے ہیں اور شاعری میں عوامی درد، تڑپ اور کسک دکھائی دینے لگتی ہے۔ اس کا اظہار 'سوچ' 'چند روز اور مری جاں' 'کتے' 'بول' 'رقیب سے' 'مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ' 'موضوعِ سخن' 'ہم لوگ' وغیرہ نظموں میں ہوتا ہے۔ 'رقیب سے' کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں جن [illegible] کو غریبوں کے دکھ درد کا احساس ہو گیا ہے اور انھوں نے غریبوں کی حمایت کرنا سیکھ لیا ہے:

عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے رُخِ زرد کے معنی سیکھے

اس طرح نقش فریادی کے دوسرے حصے کی نظموں اور غزلوں کی فضا میں رومان اور درد و کسک کا امتزاج صاف طور پر دکھائی دینے لگتا ہے۔ شاعری میں انفرادی غم کی جگہ اجتماعی غم لے لیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بات اور واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ اشتراکیت سے قریب ہونے کے باوجود وہ عشق اور رومان سے مکمل طور پر اپنے آپ کو الگ نہیں کر پاتے ہیں حالاں کہ ان کی کچھ نظموں اور غزلوں میں روایت سے بغاوت، عوام سے بے پناہ ہمدردی اور معاشرے کی ابتر حالت کی جھلک ملتی ہے۔ فیض کی اشتراکیت کے سلسلے میں محمد علی صدیقی لکھتے ہیں:

''فیض کے یہاں اشتراکیت ایک فکر دلپسند ہے جو ان کی غزل اور نظم کا خمیر اٹھاتی ہے۔''

(ذاتی خط، ص۲)

'دست صبا' تک پہنچتے پہنچتے فیض کے سیاسی شعور میں پختگی آجاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی گرد و پیش کے حالات و واقعات کا بھی ان پر اثر پڑتا ہے۔ ان حالات و واقعات کا تفصیلی جائزہ اس چھوٹے سے مقالے میں ممکن نہیں۔ مختصراً یہ عرض کروں گی کہ جہاں ایک طرف یورپ میں فاشزم اور جرمنی میں ہٹلر کی بڑھتی ہوئی طاقت سے فیض اور ان کے جیسے دیگر حساس اور بیدار لوگ پریشان تھے تو دوسری طرف ہندوستان کے بھی سیاست داں اور دوسرے ذی حس لوگ ہندوستان کی آزادی، سماجی و معاشی حالت کو لے کر پریشان تھے۔ فیض بھی ہندوستان کی دگرگوں حالت سے پریشان تھے۔ چنانچہ فیض اور فیض جیسے دیگر لوگ عوامی جنگ (Peoples War) کی آواز پر اتحادیوں کے ساتھ ہو گئے تا کہ نازی طاقتوں سے لڑا جا سکے۔ قلم کا یہ سپاہی جون ۱۹۴۳ء میں فوجی وردی میں عملی میدان میں کود پڑا۔ ہندوستان آزاد ہوا، ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ فیض کے خواب کا شیرازہ بکھر

گیا، چنانچہ آزادی کا یہ متوالا آزادی کی صبح کو داغدار کہنے پر مجبور ہو گیا۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

فیض کی شخصیت اور شاعری کو مقبول بنانے میں راولپنڈی سازش کیس کی بڑی اہمیت ہے۔ فیض اگر اسیر نہ ہوتے تو ان پر وہ سب نہ گذرتی جو ان پر گزری، تو بہت ممکن تھا کہ وہ صرف رومانی شاعر ہی ہو کر رہ جاتے لیکن جیل کے صبر آزما اور حوصلہ شکن ماحول نے ان کو انسان اور انسانیت سے اور بھی قریب کر دیا۔ قید تنہائی کی سزا کا مرتکب ہونے کے باوجود ان کے بلند حوصلے کی مثال 'دست صبا' کے سرورق پر درج وہ قطعہ ہے جس میں زنجیر کی جھنکار سے لوگوں کو بیدار کرنے کی تمنا جلوہ گر ہے:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

نظم 'دو عشق' میں رومان و اشتراک کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ جہاں اس نظم کا ایک حصہ خالصاً رومانی ہے وہیں دوسرا حصہ وطن سے محبت، انسان دوستی، اشتراکی نقطۂ نظر اور غریبوں کے دکھ درد کے احساس کا واضح ثبوت فراہم کرتا ہے، جہاں فیض کہتے ہیں۔

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
ڈھونڈی ہے یوں ہی شوق نے آسائشِ منزل
رخسار کے خم میں، کبھی کاکل کی شکن میں

☆☆☆

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے، وہ گزری
تنہا پسِ زنداں، کبھی رسوا سرِ بازار
گرجے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر
کڑکے ہیں بہت اہلِ حکم بر سرِ دربار

'ترانہ' 'ایرانی طلباء کے نام' 'اگست ۱۹۵۲' 'نثار میں تری گلیوں پہ' 'شیشوں کا مسیحا' وغیرہ نظمیں خالصاً سیاسی اور معاشی حالات سے اثر انداز ہو کر لکھی گئی ہیں۔ ان نظموں کی خصوصیت یہ ہے کہ فیض کا اشتراکی نقطہ غالب انداز میں سامنے نہیں آیا ہے، لیکن نظموں کے مطالعے اس بات کا احساس ضرور دلاتے ہیں کہ فیض کا اشتراکی نقطۂ نظر، انسان دوستی، عدل و مساوات کا احساس ان نظموں میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

نظم 'ایرانی طلبہ کے نام' تک پہنچتے پہنچتے فیض کا اشتراکی نظریہ ایک بار پھر نئے رجحان سے ہمکنار ہوتا ہے جہاں فیض عالمی سطح پر انسان کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ نیا رجحان فیض کو بین الاقوامی سطح کا شاعر بنانے میں معاونت کرتا ہے اور نظم 'شیشوں کا مسیحا' تو طبقاتی کشمکش کی آئینہ دار ہے:

ناداری، دفتر، بھوک اور غم
ان سپنوں سے ٹکراتے رہے
بے رحم تھا چومکھ پتھراؤ
یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے

☆☆☆

تم ناحق شیشے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو!

نظمیں 'زنداں کی ایک شام' اور 'زنداں کی ایک صبح' ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اول الذکر نظم میں زنداں کی شام اور موخر الذکر نظم میں زنداں کے صبح کی بہترین منظر کشی ملتی ہے۔ دونوں نظمیں منظر کشی اور ماحول کے ایک خوشگوار احساس کے ساتھ شروع ہوتی ہیں، لیکن یہ نظمیں صرف منظر کشی تک ہی محدود نہیں رہتیں بلکہ ان میں عوام کے دکھ درد کا احساس بھی موجود رہتا ہے۔ 'زنداں کی ایک شام' کے یہ اشعار قابلِ ذکر اور قابلِ غور ہیں، جن میں انھوں نے حکمرانوں پر طنز کرتے ہوئے چاند کو گل کرنے کی بات کی ہے:

اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

عتاب کا نشانہ بننے کے باوجود فیض اپنے نظریۂ اشتراکیت اور سیاسی نظریے سے چشم پوشی نہیں کرتے۔ وہ چاہے شام کے حسن کی منظر کشی کریں یا صبح کے خوشگوار اور دلفریب ماحول کی، محبوب کے وصال کی تمنا کریں یا حسن و عشق کی داستان بیان کریں، ان کی نگاہوں سے دکھی انسانیت کا کرب اور ان کا دکھ درد چھپا نہیں رہتا۔ انہیں ہر وقت غریبوں کے دکھ درد اور سرمایہ داروں کے ظلم و جبر کا احساس رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فیض کا قاری ان کی نظموں کا مطالعہ کرتے وقت دردمندی کے ایک لطیف احساس سے لذت آشنا ہوتا ہے۔ ان کی نظموں میں اس کو خود کی چلتی پھرتی تصویر نظر آتی ہے اور وہ ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ خود بھی انہیں حالات سے دوچار ہوا ہے۔ نظم 'زنداں کی ایک صبح' کا مواد سیاسی ہے۔ یہاں بھی فیض عوام کو متحد ہونے کا درس دیتے ہیں:

رات باقی تھی ابھی جب سرِ بالیں آ کر
چاند نے مجھ سے کہا، "جاگ! سحر آئی ہے
جاگ! اس شب جو مئے خواب ترا حصّہ تھی
جام کے لب سے تہِ جام اتر آئی ہے

☆☆☆

صحنِ زنداں میں رفیقوں کے سنہرے چہرے
سطحِ ظلمت سے دمکتے ہوئے اُبھرے کم کم
نیند کی اوس نے ان چہروں سے دھو ڈالا تھا
دیس کا درد، فراقِ رخِ محبوب کا غم

یوں 'دست صبا' کا شعری سرمایہ ان کے پختہ سیاسی شعور، فکر و خیال، عوام سے قربت، مضبوط نظریۂ اشتراکیت اور فکر کی عالمگیریت کا واضح ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی 'دست صبا' کے اس دیباچے سے جو انھوں نے ۱۶/ستمبر ۱۹۵۲ء کو سنٹرل جیل لاہور میں تخلیق کیا تھا، ان کے نقطۂ نظر کی صلابت اور بین الاقوامیت کا صاف اندازہ ہوتا ہے۔ شاعری کی اس منزل پر پہنچ کر وہ شاعر اور شاعری دونوں کی عظیم ذمہ داریوں سے واقف ہو چکے تھے۔ تبھی تو 'دست صبا' کے ابتدائیے میں تحریر کرتے ہیں:

"یوں کہئے شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے، اسے دوسروں کو دکھانا اس کی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کی شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر اور یہ تینوں

کام مسلسل کاوش اور جد و جہد چاہتے ہیں۔"

(ابتدائیہ 'دست صبا ص ۵)

اس طرح فیض پوری دنیا کے عوام کے ہر دلعزیز شاعر بن کر ابھرتے ہیں اور ایک راہ پا کر اپنی منزل کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

فیض کی شاعری کا یہ سفر آگے بڑھتا ہوا 'زنداں نامہ' اور پھر 'دست تہِ سنگ' کی منزلوں تک پہنچتا ہے۔ 'زنداں نامہ' کا شاعر ایک قیدی ہے اور زنداں کا ماحول صبر آزما اور حوصلہ شکن۔ یہ فیض کا کمال ہی تھا کہ انھوں نے اظہار میں تلخی اور احساس میں محرومی نہیں آنے دی۔ جس ہمت اور جواں مردی کے ساتھ اسیری کے دوران اپنی سوچ اور نفسیات کو ایک نیا موڑ دیا اور اشتراکی فلسفے کو اپنی شاعری میں جگہ دی وہ قابل قدر اور لائق تحسین ہے۔

زنداں میں رہ کر فیض وطن اور اہل وطن سے بہت قریب ہو گئے ہیں اور معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کے احساس میں شدت آ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'زنداں نامہ' اور 'دست تہِ سنگ' کے کلام میں وہ درد و کسکِ زمانہ اور ماحول کی وہ سبھی جھلکیاں نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہیں جن سے اس وقت کا معاشرہ دوچار تھا۔ چنانچہ فیض نے اپنی شاعری کے اس دور میں بات کو پر اثر بنانے کے لئے نئے زاویے اور اظہار کے نئے طریقوں کا استعمال کیا۔ اسی لئے اس دور کی شاعری میں استعاروں اور علامتوں کا استعمال کچھ زیادہ ہی نظر آتا ہے۔

فیض نے اپنی شاعری کے سفر میں پہلی مرتبہ شعوری طور پر واسوخت کے عنوان سے 'زنداں نامہ' میں تجربہ کیا ہے۔ واسوخت میں شاعر عموماً محبوب سے بے پروائی کا مضمون بیان کرتا ہے، لیکن فیض نے روش بدلی اور ڈگر سے ہٹ کر شاعری کی۔ فیض کے یہاں محبوب کا غم وسیع ہو کر کائناتی بن جاتا ہے اور شاعر غمِ زمانہ اور غمِ حیات کی وادیوں میں پہنچ جاتا ہے۔ یہی فیض کی انفرادیت ہے۔ اس کے ساتھ ہی زمانہ اور حالات نے ان کو جو غم دیئے، نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی تلخی زبان پر آ جاتی ہے، چنانچہ پکار اٹھتے ہیں۔

لب پہ ہے تلخیِ مئے ایام ورنہ فیض
ہم تلخیِ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

جیسے جیسے ان کے جذبات شدت کا رخ اختیار کرتے ہیں، ویسے ویسے اشتراکی رجحانات بہت تیزی کے ساتھ نظم وغزل کے پیرائے میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں۔ فیض کا لہجہ تلخ اور دھار دار ہو جاتا ہے۔ تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں کا استعمال زیادہ تعداد میں ہونے لگتا ہے۔ جن نظموں میں نظام حکومت پر تنقید کی ہے، ان میں بھی استعاروں کا استعمال زیادہ ہوا ہے۔ اس کی مثال اس دور کی دو نظمیں 'ملاقات' اور 'دریچہ' ہیں۔

نظم 'ملاقات' رات اور درد کے شجر جیسے اشاروں سے شروع ہوتی ہے اور ستاروں کے کارواں، شجر کے زرد پتوں اور گیسوؤں میں الجھ کر گلنار ہونے اور ہیرے پرونے تک جاتی ہے۔ فیض نے درد کے استعارے کو 'مجھ سے تجھ سے عظیم تر' کہہ کر بین الاقوامی انسانیت کے دکھ درد کا احساس دلایا ہے۔

اسی طرح نظم 'دریچہ' بھی دو علامتوں دریچہ اور صلیب سے شروع ہوتی ہے اور سارے منظر کو سامنے لے آتی ہے جن کا تعلق حضرت عیسیٰؑ سے ہے۔ ایک تیسری علامت مسیحا کا استعمال اپنی دو علامتوں یعنی صلیبوں اور دریچے سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ ساتھ ہی دریچہ نظم کا عنوان بھی ہے۔ یوں پوری نظم دو استعاروں ''صلیب'' اور ''مسیحا'' کی تشریح ہے۔ اس نظم میں تصور کے ارتقاء کو جس فنی چابکدستی سے بروئے کار لایا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے:

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لئے
ہر ایک وصلِ خداوند کی امنگ لئے

جیل کے ماحول، عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں، آزادی کے متوالوں پر ہونے والے ظلموں نے مل کر جب فیض پر اپنا اثر ڈالا تو خود بخود لہجے میں فرق آ گیا۔ ان اثرات سے متاثر ہو کر لکھی جانے والی نظمیں 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے' اور 'آ جاؤ افریقا' ہیں۔ ان نظموں میں پہلے کی

نسبت لے تھوڑی تیز ہو گئی ہے۔ 'دستِ تہِ سنگ' کا وہ کلام جو زنداں کی تخلیق ہے، کی بعض نظموں پر تلخی، بیزاری، تلملاہٹ اور جھنجھلاہٹ کا غلبہ طاری ہے۔

ایک مرتبہ پھر فیض کو حکمرانوں کے عتاب کا نشانہ بننا پڑا اور انھیں ۱۸؍اکتوبر ۱۹۵۸ کو سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ 'تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارہ نہیں' ''شورشِ زنجیر بسم اللہ'' ''آج بازار میں پا بجولاں چلو!'' 'کہاں جاؤ گے' 'شہر یاراں' 'خوشا ضمانتِ غم' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو ان کی ذہنی کیفیت اور اشتراکی نظریہ کی غمازی کرتی ہیں۔ ان نظموں میں انھوں نے جن حالات وواقعات کا تذکرہ کیا ہے، اس سے وہ ذاتی طور پر خود دوچار ہوئے ہیں اور جس نے ان کے دل ودماغ پر براہِ راست یا بالواسطہ اپنے اثرات مرتسم کئے ہیں۔ ان حالات وواقعات سے دوچار ہونے پر انسان اور انسانیت کے تئیں جو درد اور ٹیس ان کے دل میں رہ رہ کر اٹھتی تھی، اس کو ظاہر کرنے کے لئے انھوں نے جن ترکیبوں، استعاروں، علامتوں وغیرہ کا انتخاب کیا، ان میں بھی ہمیں کسی زخمی پرندے کی پھڑ پھڑاہٹ کی صدا صاف سنائی دیتی ہے۔ اردگرد کے ماحول سے جو کچھ اخذ کیا، اس کو 'شورشِ زنجیر بسم اللہ' میں نظم کر دیا۔ اب فیض سب کچھ برملا کہنے لگے:

ستم کی داستاں، کشتہ دلوں کا ماجرا کہیے
جو زیرِ لب نہ کہتے تھے، وہ سب کچھ برملا کہیے
مُصر ہے محتسب، رازِ شہیدانِ وفا کہیے
لگی ہے حرفِ ناگفتہ پر اب تعزیر بسم اللہ
سرِ مقتل چلو! بے زحمتِ تقصیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

'تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارہ نہیں' میں حکمرانوں، سیاسی آلام و تلخی روزگار پر کڑی تنقید کی ہے۔ نظم 'شام شہر یاراں' اس وقت کی صورت حال سے پریشان ہو کر لکھی گئی ہے جس میں ماتمی تاروں کے صفوں کے بجھنے کا ذکر بڑی حسرتناک انداز میں کیا گیا ہے۔ فیض کی قید وبند کی نظموں کے بارے میں:

رام لعل اپنے ایک مضمون 'فیض کی مقبولیت میں جیل کا ہاتھ' میں علی سردار جعفری کا یہ قول لکھتے ہیں:

"فیض کو آتش خانوں کی مقدس آنچ ملی ہے، مگر اس نے انہیں جلایا نہیں
بلکہ ان کی شخصیت کو قوت اور ان کی شاعری کو تب و تاب بخشی ہے۔"

(فیض احمد فیض۔ شخص اور شاعری، مرتبہ اطہر نبی ص ۲۶۲)

سیاسی و سماجی اور اشتراکی نقطۂ نظر کے پختہ ہونے کے ساتھ شاعری میں علامتوں اور استعاروں کا استعمال بڑھ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'نقشِ فریادی اور 'دستِ صبا' کی غزلوں کے مقابلے میں 'زنداں نامہ' اور 'دست تہِ سنگ' کی غزلوں میں کافی فرق آ گیا، اشتراکی و سیاسی موضوعات غزلوں میں جگہ پانے لگتے ہیں۔ اس لئے اس دور کی غزلوں میں رومانیت اور جذباتیت کی کمی نظر آتی ہے۔

اس زمانے میں لکھی جانے والی غزلیں ان کے بھرپور سیاسی و اشتراکی رجحان کی غمازی کرتی ہیں۔ اور اپنے عہد اور ماحول کی آئینہ دار ہیں۔ فیض کی غزلوں میں روایتی غزل میں استعمال ہونے والے الفاظ فراق، شام، درد، ہجر، بزم خیال وغیرہ نئے معنی و مفاہیم دیتے ہیں۔ محبوب کی کج ادائیوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ ان کی غزلیں انسانی زخم کے لئے مرہم کا کام کرتی ہیں۔ دلوں کو توڑنے کے بجائے جوڑتی ہیں۔ انسانیت کا درس دیتی ہیں۔ انسان اور انسانیت کے درد کے رشتے سے منسلک ہیں، اسی لئے تو انسان دوست شاعر جو جیل میں ہے، پکار اٹھتا ہے:

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غم گسار چلے

شاعری کے اس دور میں فیض انسان اور انسانیت سے اس قدر قریب ہو جاتے ہیں ساتھ ہی ان کا اشتراکی نقطۂ نظر اتنا پختہ ہو جاتا ہے کہ جہاں 'دست صبا' میں وہ انسان اور معاشرے کے دکھ درد سے گھبرا کر محبوب کی وادیوں میں پہنچ جایا کرتے تھے، وہیں اب انسانی دکھ درد اور دوسری مشکلات سے گھبرا کر وہ محبوب کی وادیوں میں بھٹکنے کے بجائے اپنی منزل پا لینے کی تمنا میں دار و رسن کی جانب چلے جاتے ہیں:

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

فیض کی شاعری زندگی کا آئینہ ہے، بقول سجاد ظہیر:

"اگر تہذیبی ارتقاء کا مطلب یہ ہے کہ انسان مادی اور روحانی عسرت سے نجات حاصل کر کے اپنے دلوں میں گداز، اپنی بصیرت میں حق شناسی اور اپنے کردار میں استقامت و رفعت پیدا کریں اور ہماری زندگی مجموعی اور انفرادی حیثیت سے بیرونی اور اندرونی طور پر مصفا بھی ہو اور معطر بھی تو فیض کا شعر غالباً تہذیبی مقاصد کو چھو لینے کی کوشش کرتا ہے۔"

(زنداں نامہ، سر آغاز: سجاد ظہیر ص ۸)

فیض کو ۲۷ راگست ۱۹۶۲ء میں ماسکو میں لینن امن پرائز دیا گیا۔ انعام لیتے وقت فیض نے ایک تقریر کی تھی جس میں انھوں نے اس بات کی خواہش ظاہر کی تھی کہ قدرتی وسائل میں تمام انسانوں کو برابری کا حق ملے۔ ان کی یہ سوچ بھی تھی کہ ایک دن انسانوں کے دلوں سے جنگ و نفرت اور کدورتیں مٹ جائیں گی، ان کی جگہ صلح اور اخوت لے گی۔

انسان اور انسانیت پر مکمل یقین اور عوام دشمن طاقتوں سے سمجھوتہ نہ کر سکنے کی بنا پر ہی فیض حکمرانوں کے عتاب کا نشانہ بنتے ہیں۔ 'سر وادیٔ سینا' کی نظم 'انتساب' ان کی عوام سے بے پناہ محبت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں بین الاقوامی سطح پر انسانوں کے دکھ درد کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے۔ وہ ان کی بین الاقوامی سطح پر انسان دوستی کی ضمانت بھی دیتا ہے۔

نظم 'بلیک آؤٹ' اور 'سوچنے دو' تک پہنچتے پہنچتے فیض کی زندگی ناامیدی و نامرادی کا شکار ہو جاتی ہے اور فرط و انبساط کی شمع، شمع سحری کی مانند مدھم پڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ شاعری بھی اس اثر سے بچ

نہیں پاتی، چنانچہ اداسی و ناامیدی کی جھلک کلام میں واضح طور پر دکھائی دینے لگتی ہے۔ یہ اداسی و ناامیدی ان کے ابتدائی و آخری دور کے کلام میں واضح فرق پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ اس دور کے کلام میں چند نظموں اور غزلوں کو چھوڑ کر، پہلے والی کیفیت باقی نہیں رہ جاتی۔ اشتراکی اور رومانی خیالات کے درمیان چلنے والی اس کشمکش کی جنگ سے فیض گھبرا جاتے ہیں اور آخر میں پریشان ہو کر انھوں نے دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کا اعتراف انھوں نے 'شام شہر یاراں' میں شامل نظم 'کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا' میں کیا ہے :

هم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا کچھ کام کیا
کام عشق کے آڑے آتا رہا
اور عشق سے کام الجھتا رہا
پھر آخر تنگ آ کر ہم نے
دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

فیض کو فلسطین اور اہل فلسطین سے بے پناہ محبت ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے مجموعہ 'مرے دل مرے مسافر' کو یاسر عرفات کے نام معنون کیا ہے۔ فیض کے لئے یہ بڑا گہما گہمی کا زمانہ تھا۔ ایک طرف تو فیض غیر ممالک کے دورے کر رہے تھے اور دوسری طرف بین الاقوامی سطح پر انسان دوستی اور عالمی مسائل کو اشتراکی نقطۂ نظر سے سلجھانے کی تمنا اور دیگر بہترین کاموں کی بدولت ان کی شہرت اور مقبولیت دن دونی رات چوگنی بڑھ رہی تھی اور فیض عالمی سطح پر لوگوں کے ہردلعزیز شاعر بنتے جا رہے تھے۔

فیض کی بین الاقوامی سطح پر اشتراکی نظریئے کی وسعت و ہمہ گیری کی دلیل ان کی وہ نظمیں ہیں جن میں انھوں نے قومی سطح سے اوپر اٹھ کر بین الاقوامی سطح کے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا

ہے۔ ان میں 'فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے'، 'فلسطینی بچے کی لوری' 'ایک ترانہ فلسطینی مجاہدوں کے لئے' اہم ہیں۔ یہ نظمیں ان کی فلسطین اور اہل فلسطین سے بے پناہ محبت کی غمازی کرتی ہیں۔ فلسطین اور اہل فلسطین سے بے پناہ محبت ہی ان سے یہ کہلواتی ہے:

''اے ظالمو! اگر تم ایک فلسطین برباد کرو گے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میرے دل میں تو اتنے زخم ہیں کہ اس سے کئی فلسطین آباد ہو جائیں گے۔ میرے دل میں فلسطین اور اہل فلسطین کے لئے جو محبت ہے وہ کبھی ختم نہ ہوگی۔''

انسان اور انسانیت کے تئیں یہی سچا جذبہ جو فیض کی شاعری کا ایک اہم اور نمایاں حصہ ہے، انھیں بین الاقوامی شہرت کا حامل بناتا ہے۔ اس طرح انھیں جو شہرت و مقبولیت ملی وہ کسی اور شاعر کا حصہ نہیں۔ بقول ڈاکٹر محمود الحسن:

''فیض کے سارے محسوسات اور افکار انفرادی ہوتے ہوئے بھی سماجی اور معاشرتی کشمکش کا احساس دلاتے ہیں، یعنی انھوں نے اپنی شاعری کی ابتدائی منزل پر جو نظریۂ حیات اپنایا تھا، اس کی ترجمانی ساری عمر کرتے رہے۔ یہاں یہ بحث مقصود نہیں کہ کیا کوئی شاعر محض نظریاتی شاعری کی بنیاد پر عظمت حاصل کر سکتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ فیض اپنی ایک الگ آواز رکھتے ہیں جس میں ان کا ذاتی کرب اپنے عہد کی کشمکش بن کر سامنے آیا ہے۔ یہی ان کی انفرادیت ہے اور یہی ان کی عظمت کا راز۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسی چیز نے ان کو عالم انسانیت کا ترجمان بنا کر آفاقی حیثیت بخش دی۔'' (فیض کی شاعری کا امتیازی پہلو: فیض۔ شخص اور شاعری مرتب اطہر نبی ص ۲۵۵)

اور بقول ڈاکٹر لدمیلا واسی لیوا (ماسکو سویت یونین)

''اپنے حسین ترین اشعار کے ذریعے فیض نے نہ صرف اپنے ملک اور اپنے عوام کے درد و غم کی غمازی کی ہے بلکہ ہمارے پورے دور کی غمازی بھی کی۔''

(امید سحر کی بات سنو! فیض۔ شخص اور شاعری مرتب اطہر نبی ص ۲۵۵)

غرض فیض کے دور اول کا کلام ہو یا دور آخر کا، اپنی ہمہ گیر وسعت، انسان دوستی اور اشترا کی نقطۂ نظر کی بنا پر اہمیت کا حامل ہے۔ شاعری کی ابتدائی منزل پر انھوں نے جن نظریات کو شاعری کا بنیادی مقصد بنایا تھا، آخر تک وہ ان نظریات پر سختی سے کاربند رہے اور اپنے نظریات اور خیالات کی ترویج و اشاعت اپنی شاعری کے ذریعہ کرتے رہے۔ ان کا یہی نظریہ انھیں نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی شاعر بنانے میں ایک اہم اور کامیاب رول ادا کرتا ہے۔

فیض: تجھ کو چاہا تو اور چاہ نہ کی

سیما اوجھا

اُتر پردیش کے شہر بلیا میں تعلیم شروع کی۔ حالانکہ تاریخی اعتبار سے اس شہر کا قومی جد و جہد میں ایک اہم مقام ہے پھر بھی یہ معاشی طور پر ایک پچھڑا ہوا علاقہ تھا لیکن گھر کا ماحول کافی کھلا ہوا ملا اور ہمارے گھر میں اور اخباروں کے علاوہ بلٹز بھی پہنچتا تھا۔ سب چیزیں تو سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر جو پلّے پڑتا اس کو ذہن میں جما لیتے لیکن اس وقت خواب و خیال میں نہیں تھا کہ ایک روز مدیر بنیں گے اور وہ بھی دلّی سے شائع ہونے والے آجکل (ہندی) کے۔

اکتوبر 2010 میں آجکل (ہندی) کا کام سنبھالتے ہی میرے دماغ میں اگلے شماروں کی روپ ریکھا تیار ہونے لگی: دسمبر اشک، جنوری شمشیر۔ یوں تو ہندی ادب سے دلچسپی رہی لیکن جب بارہویں جماعت میں پہنچے تو فیض کی نظم 'بول کہ لب آزاد ہیں تیرے' پڑھی تو ایسا لگا کہ یہ اپنے ہی دل کی آواز ہے اور جب فیض نمبر نکالنے کا مشورہ راجیش جھا کی طرف سے آیا تو فروری 2011 کا شمارہ ان کے نام ہو گیا۔ لیکن کام اتنا آسان نہیں تھا۔ باتوں باتوں میں شیام سوشیل نے اطلاع فراہم کی کہ 'نیا پتھ' کے لیے مُرلی منوہر پرساد سنگھ اور چنچل چوہان کی ادارت میں فیض پر ایک ضخیم خاص نمبر تیار ہو رہا ہے۔ بس کیا تھا ایک صبح ان کے گھر پہنچ گئے۔ کرشن کلپت سے ملاقات ہوئی اور ظہور صدیقی کا غیر شائع شدہ لیکھ 'فیض: کچھ لمحے، کچھ باتیں' ہاتھ لگا۔

پھر پنجابی زبان کے ادیب و مترجم سُر جیت سے بات ہوئی۔ بزرگی کے سبب وہ آجکل کے دفتر نہیں آسکتے تھے تو پھر ایک صبح 40 کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے اپنی ہمنوا فرحت کے ساتھ ان کے گھر پہنچ گئی وہاں ملا خزانہ۔ اور نہ صرف انہوں نے آجکل (ہندی) کے اس قدم کی تعریف کی بلکہ لاہور سے نکلنے والے 'ماہِ نو' رسالے سے ترجمہ کر کے بھی پیش کر دیا۔ کیول گوسوامی نے انگریزی سے ترجمہ کئے مقالے دیئے۔ پھر مُرلی منوہر پرساد سنگھ نے کے جی ورما کا ایک مضمون ہمارے حوالے کیا۔ اور سال کے جاتے جاتے 31 دسمبر 2010 کو اپنے پرانے ڈائریکٹر وشوناتھ رام شیش سے ایک موسیقی کے پروگرام میں شامل ہونے کا مدعو نامہ ملا جہاں پریم ٹیانی نے فیض کی ایک غزل سنائی، قسمت جاگ گئی اور انہوں نے ایک دن اپنی یادداشت پر مبنی مقالہ 'دل کی نہیں دماغ کی سنتا' ہمیں عنایت کیا۔ فیض نمبر کی دھن میں لگے تو رسمِ دعا بھی بھول گئے اور پریوار کے فنکشنس (Functions) کو بھی۔ لیکن میں نے اس دوران پایا کہ فیض کی شخصیت ہی ایسی ہے کہ شاید ہی کوئی کافر ہو جو ان پر لکھنے پر انکار کر بیٹھے! اس طرح سفرِ فیض کامیابی کی طرف گامزن ہوتا گیا اور ہماری جھولی ادبی رچناؤں سے بھرتی چلی گئی۔ اور جب بہت کچھ حاصل ہو گیا تو سوچا (یہ مشورہ نور ظہیر نے دیا تھا) کہ شیلا سندھو، جنہوں نے 1965 میں راجکمل کی کمان سنبھالی تھی، سے ملاقات کر لی جائے۔ اس پبلشنگ ہاؤس نے ہندی میں فیض پر کئی کتابیں شائع کی ہیں اور ان میں سے ایک کے تخلیق کار مغیث الدین فریدی اور شمشیر بہادر سنگھ (جن کی جنم شتی بھی 2011 میں ہے) تھے، اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

شیلا سندھو نے ہمیں بتایا کہ جب پہلی بار فیض ہمارے گھر آئے تو ہمیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ اتنے عظیم ترقی پسند شاعر ہیں اور پھر انکساری کا یہ عالم تھا کہ کہتے 'ہم کہاں کے اتنے بڑے ترقی پسند شاعر! آپ ہمیں ایک ادنیٰ شاعر ہی تسلیم کر لیں تو یہ ہی غنیمت ہے' اور جو وہ کہتے اس کو شائع کرنے کے معاملے میں بھی وہ بہت لاپرواہ تھے۔ کھانا جو مل گیا کھا لیا۔ ان کی بیٹیاں بھی ہمارے گھر آجاتی ہیں۔ گذشتہ ماہ ہی منیزہ آئی تھی۔ دراصل یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ فیض ہمارے گھر ٹھہرے۔ وہ واقعی بہت عظیم تھے...... زیادہ بات چیت نہ ہو پائی کیونکہ شیلا جی کی طبیعت ناساز تھی۔

فیض سے میرا رشتہ اسی خاص نمبر کی ادارت کے بیچ گہرا ہوتا گیا۔ خود کو بھی ان کے کلام سے ہمکنار ہونا پڑا اور جو لکھے ملے ان کو پڑھ کر اپنی جانکاری بھی بڑھی۔ بھلے ہی فیض کہیں کہ نہ وہ 'یوسف' ہیں اور نہ 'یعقوب' جوان کو 'یاد' کیا جائے۔ لیکن یہ ناچیز بھی کیا کرے، وہ ان کی شاعری پر موہت بھی ہو گئی ہے اور ان کی شخصیت کو سلام کرنے پر بھی مجبور ہے۔ برِ صغیر کے بہت سے ادیب ہیں، فنکار ہیں مگر جو انسانیت کی روشن شمع ان کے کلام میں ملتی ہے اس کی کرنیں کہاں تک نہیں پہنچتیں—اور پھر ان اذیتوں کو دیکھئے جو انہوں نے بزدواسن (چاہے جیل میں یا ملک سے باہر) کے درمیان بھگتیں۔ کبھی اُن کو غدار کہا گیا کبھی پٹھو کہا گیا اور پھر کونسی تہمت تھی جو ان پر نہ لگائی گئی ہو لیکن واہ فیض! سر اٹھا کر سب جھیلتے رہے۔

اور جب آپ ان کی نظم 'دو عشق' کے ان اشعار پر نظر ڈالتے ہیں تو مشکل سے اپنے آنسوؤں کو روک پائیں گے:

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اِس عشق نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں' بجز داغِ ندامت

کیسا پیارا انسان تھا، الفت کا سمندر تھا: اس کے ہر سانس سے انسانیت کی مہک آتی تھی۔ آج ان کی یاد میں ہندو پاک کا عام انساں، جو اچھے انسانوں کو دیکھنے سے ترس گیا ہے، سچ پوچھیے تو ایسے انسان کے صرف خواب ہی اس کے پاس رہ گئے ہیں، اور کچھ نہیں! لیکن فیض کی طلسماتی شاعری کو چھونے کے بعد پھر ایک زندگی لوٹ آتی ہے جو ناکام تو ہے مگر 'نا امید' نہیں:

دل نا اُمید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

فیض کی شاعری ایک ایسا دلکش نغمہ ہے جو بظاہر رومانی لگتا ہے مگر اصلاً اجتہادی ہے۔ اپنے

رومانی تیور میں بھی اس میں انقلابی شعور ہے۔ ایک طرف وہ اس وقت ڈٹے رہے جب انگریزی سامراجیت اپنا ہاتھ ہندوستان سے کھینچنے کے لیے تیار نہیں تھی اور ہر طرح کے دمن کو جائز سمجھتی تھی۔ اُسی سامراجوادی سیاست نے ہمارے عظیم سینے کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے اور آج بھی الگ الگ تڑپ رہے ہیں لیکن فیض نے اس لکیر کو اپنے دل پر کبھی حاوی نہیں ہونے دیا۔ وہ مرتے دم تک انسانیت کے نقیب رہے، تیسری دنیا کی آواز ان کی اپنی آواز تھی۔ افریقہ کے جیالے ان کے اپنے تھے اور پھر ہندوستان تو ان کی محبوبہ ہی بنا رہا۔ اور آج وہ 'عاشق' ہمارے بیچ میں نہیں رہا لیکن اس کے شبد تو ہمارے کانوں میں گونجتے رہیں گے:

''مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی ہار نہیں کھائی اب بھی فتحیاب ہو کر رہے گی۔''

کیا حوصلہ تھا! کیا عزم تھا! اور ان کی شاعری کے سب پہلوؤں کی ایک ہلکی سی جھلک اور ان کی بلند شخصیت کا تھوڑا سا روپ آجکل (ہندی) میں، جنم شتی (پیدائش صد سالہ) کے مبارک موقع پر میں جو پیش کر پائے اس کے لیے ایک بار پھر سب قلمکاروں کا جنہوں نے ہمیں اپنی تخلیقات سے نوازا اُن کا شکریہ تہہ دل سے ادا کرتی ہوں اور اختتام پر مرلی منوہر پرساد سنگھ، شیام سوشیل، دیوشنکر نوین اور راجیش کمار جھا جنہوں نے اپنے مشوروں سے، تصویروں سے ہمیں نوازا، ان کے لیے ڈھونڈنے سے بھی شبد نہیں ملتے۔

'فیض' خاص نمبر آنے کے بعد قارئین نے ہماری کوشش کو بہت سراہا ہم ان کے ممنون ہیں: بھلے یہ کاوش فیض کی قد آور شخصیت کے آگے کچھ بھی نہیں اور نہ ہم میں وہ صلاحیت ہے کہ ہر شبد پر 'زبان' رکھ دیں لیکن یہ سوچتے ضرور ہیں کہ فیض اردو ادب کے لیے نہیں ہندی ادب کے بھی ایک انمول امانت ہیں اور ان کی رچنائیں آج بھی زندگی کا پیغام دے رہی ہیں: صحیح معانی میں ان کے تئیں ہماری عقیدت اس وقت ہی اپنے مقصد کو پائے گی جب کہ ہم سب فیض کے اشعار کو، ان کے کہے ہوئے شبدوں کو گہرائی سے سوچیں، ان پر عمل کریں۔

تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز

مُرلی منوہر پرساد سنگھ

سنہ 2011 ہندی۔ اردو کے کئی ادیبوں کی پیدائش۔ صدی (جنم شتابدی) کا سال ہے۔ ہندی کے اگیئے، ناگارجن، کیدار ناتھ اگروال، شمشیر بہادر سنگھ، بھونیشور اور اردو کے رچناؤں میں فیض یا مجاز کی صدی منانے کے لحاظ سے یہ سال ہماری کلچرل تواریخ کا بہت ہی اہم دور ہو گیا ہے۔ 1911 میں پیدا ہونے والے یہ سبھی تخلیق کار 1930 سے لگ بھگ بیسویں صدی کے اختتام تک ہندی۔ اردو کے ادبی منظر پر چھائے رہے۔ بیسویں صدی کے اس دور میں قومی آزادی کی جدو جہد بھارت۔ پاک تقسیم کے ساتھ ساتھ آزادی اور نئے ڈھنگ کے جمہوری اور انقلابی اندولن کے اثر سے ہندی۔ اردو کی ادبی تخلیقیت کے دائرے میں طرح طرح کے نئے رجحانات کا ظہور ہوا۔ ان نئے رُجحانات کو آگے بڑھانے والوں کے روپ میں ان تخلیق کاروں کی بے مثال دین مانی جاتی ہے۔

ان سبھی تخلیق کاروں کے بیچ فیض ان جیسے بلند پائے کے شاعر ہوتے ہوئے بھی اپنی منفرد جگہ بنانے میں کامیاب ہیں۔ وہ صرف اردو بولنے والوں کے ہی محبوب شاعر نہیں ہیں ہندی اور پنجابی زبان کے بولنے والے بھی انھیں اتنا ہی پیار کرتے ہیں۔ جب فیض احمد فیض کی سترویں (70) سالگرہ منانے کے سلسلے میں ہندوستان میں 'جشن فیض' کا جشن 1980 کے اپریل مہینہ میں منعقد (آیوجت) کیا گیا تو نئی دہلی کے فکی مجلس ہال میں فیض کو سننے والوں کی ایسی بھیڑ اُمڈی کہ کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ پانچ دنوں تک یہ جشن چلا اور ہر دن مجلس ہال میں ٹھسا ٹھس بھیڑ کا ریلا آتا رہا۔

لکھنؤ، آلہ آباد، حیدر آباد، فیض جہاں بھی گئے، ان کے پریمیوں کا امنڈتا عوامی سیلاب کی شکل میں نظر آیا۔ فیض کے اس جاذبیت کے کئی اسباب تھے۔ ان کی زندگی ہو بہو اس خوبی کی روشن مثال تھی۔ کون نہیں جانتا یا سمجھتا ہے کہ ظالمانہ سرکار (شاسن) کے خلاف اور نو آزاد دیش کے غیر جمہوری سماج میں انصاف اور آزادی کے لیے آواز بلند کرنے والوں کو کیا کیا خمیازہ نہیں بھگتنا پڑتا ہے۔ ایک لکیر پر اگر ہمارا شاعر چل رہا ہوتا، یکطرفہ (اکہری) اور تضاد سے بری زندگی گزار رہا ہوتا تو فیض کی شاعری ایسی مقناطیسی کشش نہیں پیدا کر سکتی تھی۔ ایک کھاتے پیتے خوشحال خاندان میں پیدا ہوئے فیض کو 22-20 سال کی عمر میں والد کی اچانک وفات کے بعد ایک معاشی طور پر بدحال پریوار کے بیچ اپنی بی۔ اے کی تعلیم پوری کرنی پڑی اور ایم اے پاس کر کے نوکری کی تلاش میں سرگردان ہو گئے۔ امرتسر میں نوکری ملی پھر لاہور آ گئے مگر زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ اسکے بعد 40 سال کی عمر میں ملک سے غداری کے الزام میں چار سال تک اِس جیل سے اُس تک تبادلے اور اندھیرے تہہ خانے جیسی تنہائی میں اسیر زندگی کی اذیتیں بھگتنی پڑیں۔ ایوب خاں کے دورِ حکومت میں دوبارہ گرفتاری اور ایک قیدی کے بطور پھر اپنے خاندان سے بچھڑنا پڑا۔ اس کے بعد ان کو جلاوطنی کا عذاب سہنا پڑا اور اس دوران وہ لندن، ماسکو، قاہرہ، بیروت بھٹکتے رہے۔ اسرائیل کی طرف سے بیروت پر بمباری میں پھنسے لوٹس کے ادارہ یہ مرکز سے اکھڑ کر آخر کار پھر اور ٹھکانہ ڈھونڈنا پڑا۔

اس پس منظر میں فیض کی طرزِ تحریر بہورنگی ہی نہیں ہوئی، ان کی شاعری کی مخفی کنولیس بھی لگاتار عیاں ہوتا گیا۔ ان کی ابتدائی رچناؤں میں بیشک ایک نوجوان کے پریمی دل اور عشق کی رومانیت بار بار ابھرتی ہے۔ پر ان غزلوں، نظموں میں بھی حقیقت کا ذر کھتا ہے، جس سادگی، بے فکری اور تڑپتی ہوئی روح کے ساتھ بیان ہوتا ہے، وہ اپنے آپ میں لاجواب ہے۔ فراق گورکھپوری نے فیض کی عشقیہ شاعری کو دنیا کی عشقیہ شاعری میں کلاسک تخلیق کا درجہ دیا ہے۔ اس دور کی رچناؤں (تخلیقات) میں اگرچہ سب سے زیادہ مشہور نظم 'مجھ سی پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ' جس کے یہ اشعار نور جہاں کے ترنم کے ایک خاص انداز میں سارے نوجوانوں کو ایک نیا پیغام دیتے ہیں:

تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں، وصل کی راحت کی سوا

لیکن اس نظم میں صاف گوئی کے ساتھ زمانہ کے اور بھی دکھوں کا ذکر ہے جو اس دلنواز نوجوان کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے:

لَوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجئے
اب بھی دِلکش ہے تیرا حسن مگر کیا کیجئے

رومانی شاعری کے دور میں ہی فیض نے زندگی کی حقیقت کی روشنی میں 'رقیب سے' کے عنوان سے ایک عجیب و غریب نظم لکھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک نوجوان جس کو دل و جان سے پیار کرتا ہے اسے دوسرا بھی پیار کر رہا ہے۔ محبت میں رقابت تو ہوتی ہے۔ پر فیض اسے غصے یا نفرت سے نہ دیکھ کر، کس طرح دیکھتے ہیں؟ یہ اپنے آپ میں ایک انوکھی جذباتی حالت کی عکاسی کرتی ہے:

تجھ پہ برسا ہے اس بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے
تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پر اٹھتی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

فیض کی عشقیہ شاعری ابتدا میں لازمی طور پر پریم کے احساسات کی بیقراری سے منسوب کی

جا سکتی ہے۔ پر بعد میں وطن پرستی (دیش پریم) اور انقلاب کے خواب سے دھڑکتا ہوا، مظلوم عوام کی آزادی کا مستقبل اسی عشق یا پریم راگ کا حصہ ہو گیا ہے۔ 'دستِ صبا'، 'دستِ تہِ سنگ'، 'سروادیٔ سینا'، 'شامِ شہرِ یاراں' وغیرہ میں پہلی جیسی رومانیت کے بجائے حقیقت نگاری کا رجحان حاوی ہوتا گیا ہے۔

فیض کی شاعری سطحی قسم کی نعرہ بازی کا شکار نہیں ہو پائی ہے چونکہ حقیقت کو اُجاگر کرنے اور روایت کے اندر گنجائش پیدا کرنے والی نمایاں ترکیبوں کی تلاش میں فیض کو از حد کامیابی ملی۔ زندگی کی مصیبتوں، تباہیوں اور ظلم و ستم سے جوجھتے ہوئے لوگوں کی آشا۔ نراشا، خواب اور شبہ (آشنکا)، ہار و جیت سے پرے پختہ ارادہ (سنکلپ شیلتا) وغیرہ کو اپنے اندر سمو کر اپنے فنِ تحریر کو اعلیٰ سطح تک اُٹھانے کا ہنر (گُر) فیض کی لگاتار (نرنتر) کوششوں کا نتیجہ ہے۔

لاہور فیض کے زمانے میں ایک ایسا مرکز تھا، جس میں اردو، ہندی اور پنجابی کے نئے پرانے ادیب و موسیقی (سنگیت) کے دائرے میں اپنی صلاحیت (پرتیبھا) کا چمتکار دکھلانے والے، صحافت کو نئی شکل دینے والے اور فلم کی نئی تکنیک میں استعمال کرنے والوں کی بھرمار تھی۔ اس کلچرل پس منظر کا فائدہ فیض کو ملا۔ اسی لاہور میں ملک کے بٹوارے کے وقت حیوانی خون خرابہ اور بربرتا کا گھناؤنا غیر انسانی روپ بھی فیض نے دیکھا۔

ہندوستان کی آزادی کے نام پر جو صبح ہمیں ملی۔ اس صبح کو برٹش سامراجواد نے سانپ کا زہر اُگلتے ہوئے اندھیری رات میں بدل دیا۔ جس آزاد دیش کا ہم انتظار کر رہے تھے ویسا نہ تو دیش ملا اور نہ آزادی کی وہ صبح ملی!

برِ صغیر ہند کا بٹوارہ بھارت اور پاکستان دو ملکوں کے روپ میں ہوا، قیامت بپا ہو گئی، کروڑوں لوگوں کا بے گھر ہونا اور لاکھوں لوگوں کا وحشیانہ ڈھنگ سے قتلِ عام۔ سب کچھ فیض کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ اِدھر سے اُدھر تک دوزخ ہی دوزخ تھی۔ خون سے نہائے ہوئے اور جلتے و سُلگتے ہوئے لاہور کے ہولناک منظر دیکھ کر فیض نے 'صبحِ آزادی' عنوان سے نظم لکھی:

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، وہ یہ سحر تو نہیں

اتنا ہی نہیں، آزادی کے نام پر بھارت۔ پاکستان دونوں ملکوں میں سرمایہ داروں اور زمینداروں کے اتحاد نے گُل کھلایا۔ اب ان کی حکومت تھی اور جو برٹش حکومت کے چھوڑے ہوئے افسروں کے ذریعہ انھیں قانونوں پر مبنی حکومت چلانے لگی۔ ظاہر ہے کہ فیض اس طرح کی تبدیلی سے نالاں تھے جہاں ان کی اُمیدوں کا منہ چڑایا جا رہا تھا۔ فیض کے لیے ایک نازک گھڑی تھی مگر ان کا حوصلہ قائم رہا اور ان کے قدم ایک بار پھر منزل کی طرف گامزن ہونے لگے:

نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو۔ کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

ٹوٹی ہوئی تمناؤں کی ٹیس اور آگے آگے سنگھرش جاری رکھنے کا حوصلہ۔ یہ دونوں بجز فیض کی شاعری کے ستون ہیں۔ ایسی نظموں یا غزلوں کو سن کر یا پڑھ کر کوئی خاموش، لاتعلق اور غیر جانب دار نہیں رہ سکتا۔ فوراً ہی یہ مصرعے دھیمی دھیمی گونج پیدا کرتی ہیں، لوگ انھیں گنگنانے لگتے ہیں اور وہ ایک مجموعی لے کی تال پر جھومنے لگتے ہیں۔ بیگانہ تو کوئی رہ نہیں سکتا کیونکہ ان کے احساس کو یہ شاعری ایک نئی زندگی عطا کر دیتی ہے۔

سطوت پر قابض تاناشاہوں کے خلاف لکھی جانے والی غزلوں، نظموں و گیتوں کو جو فیض کی شاعری کے مختلف گلوکاروں کے ذریعہ الگ الگ انداز میں گائے گئے ہیں، اگر دیکھیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فیض خود موسیقی کی اس روایت کے خالق ہیں۔ شائع ہوئی ان نظموں و غزلوں کا وہ دلکش اثر نہیں پڑتا جو سنگیت میں ڈھلنے کے بعد پڑتا۔ جب اسے مہدی حسن، اقبال بانو وغیرہ کی آواز میں سنیں تو ایک محسور کن فضا چھا جاتی ہے۔

جیل کے دوران لکھی گئی 'زنداں کی شام' استحصال پر مبنی حکومت کو نہ صرف منہ توڑ جواب دیتی ہے بلکہ اُن سب سرکاروں کو بھی للکارتی ہے جو سنگینوں کے سہارے عوامی حقوق کی پامالی کرتے ہیں:

ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل

جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

'دیش سے غداری' کے مقدمے کے تحت سزا بھگتنے کے بعد 1955 میں جب فیض رہا ہو کر آئے تو 1958 میں پاکستان ٹائمز کے مدیر کی حیثیت سے لکھی گئی تنقیدی تبصرے کے سبب فوجی حکومت نے انھیں دوبارہ گرفتار کرلیا۔ پورے پاکستان میں عوام کا غصہ تھا، اسے ظاہر کرتے ہوئے فیض نے ایک نظم لکھی، آج بازار میں سرے عام نکلو اور تمہارے پیروں میں غلامی کی علامت زنجیر ہو:
'آج بازار میں پابجولاں چلو' یہ نظم بھی وقت کی نسبت سے ایک انقلابی جھنکار بن گئی!

اسلامی کٹر پن کا لباس اوڑھے لوگوں اور فوجی حکومت جس کی قیادت ضیاء الحق کے ہاتھ میں تھی اس نے پاکستان میں 'نہیں' حرف کو جُرم قرار دیا تھا۔ فیض پھر بھی ثابت قدم رہے اور ایک نئے انداز میں نغمہ سرا ہوتے ہیں لیکن ان کے عزم کی مضبوطی قائم ہے:

آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنھیں رسمِ دعا یاد نہیں
ہم جنھیں سوزِ محبت کے سوا
کوئی بُت کوئی خدا یاد نہیں

'محبت' کی یہ سوزش نجی نہیں، جھلسے ہوئے ملک اور عوام کے درد سے جڑی ہوئی ہے۔ فیض عشق کو دیش پریم، بھارت-پاک برصغیر کی مظلوم عوام کے درد اور ٹیس کو بیان کرنے والے سماجی روپ کو بطور ایک نشان کے دیکھتے ہیں۔ یہ عشق یا پریم انوراگ اگلی منزل تک چل کر سنگھرش کو ایک امید کے دیئے میں روشن کردیتا ہے۔ اسی لیے یہ مانا جاتا ہے کہ فیض امیدوں کے شاعر ہیں، جدوجہد میں ان کا یقین مکمل ہے اور مستقبل کی آہٹوں کو وہ سن سکتے ہیں شاید اسی لیے وہ اعلان کرتے ہیں:

تم اپنی کرنی کر گزرو
جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا

1967 کے آس پاس جب عرب۔ اسرائیل جنگ ہوئی تو پورے عالم میں امریکی پٹھو اسرائیل سرکار کی حملہ آور، تشدد آمیز کارروائی کو لے کر غصہ پھوٹ پڑا۔ عالمی رائے عامہ نے بھی اسرائیلی فوجوں کے ذریعہ سِنائی کی گھاٹی پر کی جارہی بمباری اور قبضے کی ننگی بربرتا (حیوانیت) کی مخالفت کی۔ اسی دور میں فلسطینی آزاد تنظیم کی بنیاد پڑی۔ عالمِ عرب میں مصر، جارڈن، شام وغیرہ کے حکمرانوں کی ڈاماڈول پالیسیوں کی وجہ سے ہی فلسطینی آزاد تنظیم کی آزادانہ کارروائی کی تاریخی ضرورت پیدا ہوگئی تھی۔

عرب جگت اور عالمی سیاست کی اس تاریخی پس منظر کو عیاں کرتے ہوئے فیض نے 'سرِ وادیٔ سینا' عنوان سے ایک کویتا لکھی۔ سِنائی کی وادی ہی وہ جگہ ہے جہاں عیسیٰ سے پہلے پیغمبر موسیٰ نے اللہ سے اپنے دیدار کرانے کی آرزو کی تھی۔ بھلے ہی وہ اس رونمائی کی تاب نہ لا سکے مگر الہام جاری رہا۔ اس گزری ہوئی بات کو ایک نئے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وادیٔ سینا میں پھر ایک نیا جلوہ رونما ہے جو حقیقت میں ایک نیا شعلہ بن کر دہک رہا ہے۔ اس کی ہر کرن قربانی کے لیے اُکسا رہی ہے۔ اس نظم کے آخری بند میں کہا گیا: سطوت پر قبضہ جمائے ہوئے حکمرانوں کو آواز دو، ان سے کہو کہ وہ اپنے طرزِ عمل کو درست کریں، اگر ایسا وہ اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتے تو سرفروشاں کا جم غفیر اٹھ کھڑا ہوگا اور پھر دار و رسن کے لالے پڑ جائیں گے:

کوئی نہ ہوگا کہ جو بچا لے
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگا
یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

فیض اس نظم کے ذریعہ صرف عرب۔ اسرائیلی جنگ کے وقت تک ہی اپنی للکار کو محدود نہیں کر دیتے بلکہ اپنا فرض پورا نہ کرنے والے سبھی حکمرانوں کو چنوتی دے رہے ہیں۔ اس نظم کو اگر ہم آج

مصر کی گلشناؤں کے حوالے میں دیکھیں تو اس کی ہر ایک لائن ایک دم نئے معنی ظاہر کرنے لگتی ہے۔ اس نظم کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہر دلعزیز نظم 'لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے' مانی جاتی ہے جسے اقبال بانو نے ایک انقلابی گیت کے طور پر گایا ہے۔ کمیونسٹ تحریک کو پُر معنی انداز میں فیض نے اس روپ میں پیش کیا ہے:

ہر محنت کش جگ والوں سے جب اپنا حصہ مانگیں گے
اک کھیت نہیں اک دیش نہیں ہم ساری دنیا مانگیں گے
جب صف سیدھی ہوجائیگی جب سب جھگڑے مٹ جائیں گے
ہم ہر اک دیش کے جھنڈے پر اک لال ستارہ مانگیں گے

فیض کی شاعری کے بدلتے ہوئے سُروں، رنگوں اور مختلف موضوعات کا یہ قوس وقزاحی طلسم پچاس سالوں سے زیادہ بھارت - پاک برِّصغیر کے واقعات، سرمایہ داری و سماجوادی خیموں کے تاریخی پس منظر میں بُنا گیا ہے۔ ان کی کچھ نظمیں، مرثیہ بطور یادگار لکھی گئی ہیں مثلاً حافظ، اقبال، سجاد ظہیر، مخدوم کو یاد کرنے والی یہ نظمیں تاریخ کے خاص خاص واقعات کو فروزاں کرتی ہیں۔

فیض کی شاعری کے بہت سے رنگ ہیں۔ اپنی ابتدائی رچناؤں میں عربی۔ فارسی ادب کے الفاظ کی مالا اور اردو شاعری میں رچی بسی شیلی (طرز) اپنے زمانہ کی حقیقتوں کے حوالوں سے جوڑ کر جس طرح کا استعمال انہوں نے کیا، ان سے مختلف ایک دم نئے ڈھنگ کی زبان میں اپنا بالکل الگ رنگ و روپ میں پیش کیا۔ مثال کے لیے، 'شیشوں کا مسیحا' عنوان کی نظم میں دیکھیں یا 'غبار ایام' نام کے مجموعے میں 1981 میں لکھی گئی نظم سوویت یونین کے ٹوٹنے کی آہٹوں سے بھری ہوئی ہے۔ تب سوویت سماجوادی نظام ٹوٹنے کے کگار پر تھا۔ اس الجھی ہوئی صورتِ حال پر ان کی اردو کی اکیلی بے مثال رچنا ہے۔ ایک جٹل حقیقت کو سیدھی سادی زبان میں گہرے جذبات کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے اور اس بات چیت کو سُر یلے سُروں میں گہرے اتار چڑھاؤ سے بھرا ہے:

جب دُکھ کی ندیا میں ہم نے
جیون کی ناؤ ڈالی ہے
تھا کتنا کس بل بانہوں میں
لہو میں کتنی لالی تھی
یوں لگتا تھا دو ہاتھ لگے
اور ناؤ پورم پار لگی
ایسا نہ ہوا ہر دھارے میں
کچھ ان دیکھی منجدھاروں کے
کچھ مانجھی تھے انجان بہت
کچھ بے پرکھی پتواریں تھیں

سوویت یونین کے زوال پر یہ تجزیہ شاعری کے زاویے سے استعاروں کے استعمال میں بے مثال ہے۔ اس سے الگ رنگت لیے سیدھی سادھی زبان میں فلسطینی جنگِ آزادی کے از خود نمایاں جذبات سے بھری لوری ہے، جس میں بچے کو سمجھایا گیا ہے کہ اس کے والد کیوں شہید ہوئے ہیں، اس کے بھائی اس آزادی کے خواب کو پورا کرنے والے جدوجہد کے سپاہی ہیں:

مت رو بچے
کچھ ہی پہلے
تیرے ابا نے
اپنے غم سے رخصت لی ہے
مت رو بچے
تیرا بھائی
اپنی خواب کی تتلی پیچھے

دُور کہیں پردیس گیا ہے

عوامی زبان کی مختلف رنگینیوں اور شاعری کے الگ الگ ایام کو اپنے جذب کرنے کے لحاظ سے فیض نئی پیڑھی کی تخلیق کاروں کے لیے روشنی کا ستون ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اردو کی شاعری کی روایات کی کئی اندر اٹھتی ہوئی لہروں کے ورثے سے سینچی گئی فیض کی شاعری میر، سودا، غالب اور اقبال کی ادبی صلاحیتوں و جذبات کا احترام کرتے ہوئے اردو ادب میں ایک نئے باب کا آغاز کر گئی۔ میر اور غالب کے یہاں درد کسک اور دکھ کا احساس ہماری روح کو آہستہ آہستہ اپنے گرفت میں لے لیتا ہے۔ فیض کی شاعری میں یہ کسک غمگینی تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ امید اور اگلی منزل تک جانے کا حوصلہ بھی دیتی ہے: آشا۔ نراشا (اُمید۔ نا امیدی) کا یہ تضاد ایک بڑے کینوس پر بار بار نمایاں ہوتا ہے۔

میر اور غالب کے زمانے میں بھلے ہی صحت پرور عناصر زندگی میں موجود ہوں لیکن فیض کا دور ایک بنیادی طور پر اپنی امتیازی خصوصیت رکھتا ہے۔ بیسویں صدی کے عوامی تحریکوں اور نظریاتی سنگھرشوں کی قربت حاصل ہونے کی وجہ سے فیض کی شاعری میں آزادی، جمہوری اور سماجی برابری کے خوابوں کی دنیا ہر طرح کے مصائب ودکھوں کے بیچ امید افزا ہی رہی۔

فیض کی شاعری آشا اور نراشا/حقیقت اور خواب، جنگ اور امن، تخیل اور احساس کے فطری رنگوں میں بار بار نمایاں ہوتے ہیں۔ وراثت اور حقیقت، ان دونوں سے روبرو فیض کی شاعری عوام کی روح میں بس جاتی ہے، اس کے جدوجہد سے بھرپور وجود کا اٹوٹ حصہ بن جاتی ہے۔

بھارت۔ پاک برصغیر میں یا یوں کہیں کہ اردو۔ ہندی اور پنجابی زبان سمجھنے والے کروڑوں لوگوں کے شعور (چیتنا) پر فیض احمد فیض ابھی تک چھائے ہوئے ہیں۔ 1984 کے نومبر کے مہینہ میں اس دنیا سے رخصت لینے کے باوجود ان کی شخصیت، ان کی شاعری اور ان کی غزلوں۔ نظموں کے سنگیت کا جادو بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ان کی شاعری کے ان گنت مصرعے اور شعر لوگوں کی زبان پر اس طرح چڑھے ہوئے ہیں کہ بات چیت اور بھاشن (تقریر) میں سرسری طور پر ہی نہیں ایک

لوجیکل ثبوت کی طرح اکثر استعمال میں آتے ہیں۔ مثلاً:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

یا

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

اور یہ ان کی شاعری کی برات اس مقام پہ ہی نہیں رک جاتی۔ اس کا جمہوری قدروں سے لیس شعور کسی پابندی یا گھٹن کو برداشت نہیں کرتا اور پوری آواز میں اپنے جذبات کی ترجمانی کرتا ہوا اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے: 'بول کہ لب آزاد ہیں تیرے'۔ پھر ادب کا شعور رکھنے اور بھولے بھالے عوام سمجھ جاتے ہیں جب فیض کہتے ہیں: 'اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا......' 'جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اچھالے جائیں گے......' 'کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت......' ''نثار میں تیری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں/ چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے' اور پھر اس بول پر بھی غور کریں: 'تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے'۔

غزل اور نظم کے مصرعے کا اس طرح روزمرہ استعمال کبیر کی 'ساکھیوں' رحیم کے دوہوں، میر کے شعروں یا پھر غالب کی غزلوں سے ہی ہوتا رہا ہے۔ عام کہاوتوں کے خزانہ میں فیض کی غزلوں اور نظموں کے ٹکڑے بھرے پڑے ہیں۔ کسی بھی کوی یا شاعر کی نمایاں ہردلعزیزی کا ثبوت اس کسوٹی پر بھی ہوتا رہتا ہے۔

'سرِ وادیٔ سینا' کے عنوان سے لکھا گیا مجموعہ کے شروع میں ہی 'انتساب' عنوان سے ایک نظم ہے جو دراصل عقیدت کے طور پر لکھی ہوئی۔ یہ کویتا (نظم) بتاتی ہے کہ فیض اپنی شاعری کے ذریعہ سماج اور دیش کے کن کن طبقوں یا ہم پیشہ لوگوں سے ہمکلام ہو رہے ہیں یا ان سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس سمرپن میں بتایا گیا ہے کہ یہ رچنائیں آج کے غم کے نام ہیں، دلش کے نام ہیں جو درد کے صحرا میں تبدیل ہو گیا ہے۔ 'انتساب' کی اگلی لائنیں بتاتی ہیں کہ فیض کی یہ تخلیقات ڈاکیے، تانگہ

والے، ریل والے، کے ساتھ ان کے نام بھی ہیں:

جن کے ڈھوروں کو ظالم ہنکالے گئے
جن کی بٹی کو ڈاکو اٹھا لے گئے

اتنا ہی نہیں ان کی شاعری دُکھی ماؤں کے نام بھی ہے:

رات میں جن کے بچے بلکتے ہیں اور
نیند کی مار کھائے ہوئے بازوؤں سے سنبھلتے نہیں

یعنی بیواؤں، بیبا تاؤں، کنڑیوں، گلیوں۔۔سب کے نام۔ عام لوگوں کے انہیں طبقوں کی بولی، روزمرہ کی زندگی میں رچی بسی زبان اور انہیں لوگوں کے جدو جہد کی زندگی کی کوکھ میں پلی بڑھی، دھڑکتی ہوئی اشتراکی لے کے سہارے فیض اپنی رچناؤں کے بند مصرعے اور ٹکڑے تراشتے ہیں۔ اس لیے ان کی غزلیں اور نظموں کے اندر الگ الگ قسم کی دُھنوں کا سنگیت نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس سنگیت کو فیض کے گلوکاروں نے الگ الگ دُھنوں، سروں اور تالون میں باندھ کر عوام میں ہر دل عزیز بنا دیا۔ لوگ فیض کی شاعری کے مصرعے و اشعار اور ٹکڑے اکثر گنگناتے ہیں، بات چیت یا اپنی زبان میں ان کا اکثر اس طرح استعمال کرتے ہیں جیسے وہ سب آوازیں ان کے خود کے وجود کا حصہ ہوں۔ فیض کے شبد (الفاظ) اُدھار لے کر اگر بولیں تو یہی کہنا پڑے گا: 'تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز ان کی'۔ مشاعرے میں سخنور اور موسیقی کی محفلوں میں گلوکار اسی حقیقت پر مُہر ثبت کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں اس بات کو نمایاں لازمی طور پر کرنا چاہیے کہ بیگم اختر، اقبال بانو، مہدی حسن، نور جہاں، نیرہ نور، فریدہ خانم، ٹینا سانی، مدھورانی، شبہامد گل، وِدّیا شاہ، ثمینہ ڈے، مدن گوپال وغیرہ نے فیض کی نظموں اور غزلوں پر مبنی سنگیت کو ہندی۔ اردو زبان والوں کی قومی موسیقی کا روپ دے دیا ہے۔ بنگلہ زبان بولنے والوں کے رویندر سنگیت کے برابر ہندی۔ اردو بولنے والوں کا یہ قومی سنگیت دن بہ دن ہر دلعزیز ہوتا جا رہا ہے۔

فیض کی پنجابی رچناؤں، فلموں کے لیے لکھے گئے گیتوں، دکنی غزلوں اور فلسطینی بچوں کے نام

بھی گئی لوری میں موجود موسیقی کی لے دھیان دینے لائق ہے۔ یہ قابل ذکر ہے کہ فیض کی شاعری کے اندر کی موسیقی، ناٹک و رنگ منچ کے گہرے لگاؤ سے پیدا ہوئی ہے۔ تقریباً 12 سال کی عمر سے ہی یہ رات تک سیالکوٹ کی مختلف ناٹک منڈلیوں کے ڈراموں کو دیکھنے کے سلسلے میں وہ چپ چاپ گھر سے غائب ہو جاتے تھے*۔ نوٹنکیوں کے گیت اور مکالمے ان کی یادداشت پر چھائے رہتے تھے۔ میٹرک پاس کرتے کرتے، میر، سودا، غالب، اقبال کی سیکڑوں غزلیں و نظمیں زبانی سنا سکتے تھے۔

لیکن ان کی یادداشت صرف اردو یا عربی۔ فارسی کی شاعری کی روایات تک سکڑ کر نہیں رہ جاتی بلکہ ان کے ذہن پر چھائے ہوئے پنجابی لوک گیت موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی کی طرح فطرتی طور پر ان کی شاعری کا ایک اہم وصف بن جاتے ہیں۔ عام لوگوں کے ہر طبقہ کی الگ الگ قسم کی آوازوں کو شاعرانہ انداز میں پیش کرنے کا ہنر، اصلیت میں ناٹک کی طرف ان کی جنونی کیفیت اور عوامی جدو جہد (سنگھرشوں) کے لیے مخصوص ہمدردی کے بنا نکھر کر اپنی بلندی کے اس مقام پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ فیض کی شاعری کا یہی راز ہے۔

* جو فیض کی بڑی بہن تھیں، ان کے بارے میں لکھتی ہیں: 'دھرم سالا میں بڑا میلا لگتا تھا اور فیض کو میلوں ٹھیلوں سے دلچسپی رہی اکثر میلے جایا کرتے تھے!' (اختر جمال، ہری گھاس، سرخ گلاب، 182، بول اکیڈمی، لاہور 1992) ۔۔ مدیر

فیض کے مغنّی

سہیل ہاشمی

فیض احمد فیض کی مقبولیت اوران کی شاعری کے چاہنے والوں کی لگا تار بڑھتی ہوئی تعداد کا راز سمجھنا کوئی بہت مشکل نہیں۔ فیض کے بچپن کا ماحول، ان کے اُستاد، فیض کے خیالات، ان کے نظریے پر آزادی کی تحریک اور بائیں بازو کے خیالات کا گہرا اثر فیض کی شاعری میں سماج کی بنیادی سچائیوں کی عکاسی اور مقبول سنگیت کاروں اور گائیکوں کا اس شاعر کو ہاتھوں ہاتھ لینا، وہ بنیادی چیزیں ہیں جنھوں نے مل کر فیض کو بیسویں صدی میں عوام کے سب سے محبوب شاعروں اور ادیبوں کی پہلی قطار میں کھڑا کر دیا ہے۔

فیض کے خاندان میں ادب کو پڑھنا اور اس کے بارے میں بات چیت کرنا اتنا ہی ضروری تھا جتنا زندگی کے دوسرے اہم کام کرنا— اردو، فارسی، عربی اور انگریزی ادب سے دلچسپی جو بچپن سے گھٹی میں ملی تھی، فیض کے ساتھ ہمیشہ رہی۔ انہوں نے ان زبانوں کو کالج اور یونیورسٹی کی سطح تک پڑھا، اور یہی وجہ ہے کہ فیض کی زبان اتنی مالا مال ہے جو غالب اور اقبال کے علاوہ کم شاعروں میں نظر آتی ہے۔ ادب اور شاعری کا شوق، گھر کا ادبی ماحول اور بہت سے اچھے استادوں کی سرپرستی جلد ہی انھیں شاعری کی طرف لے گیا۔

شاید فیض بھی اپنے دور کے کئی دوسرے شاعروں کی طرح شمع، پروانہ، گُل و بلبل، صیّاد، اور وصال و ہجر کے شاعر ہی رہ جاتے اگر جوانی کے دنوں میں اُن کی ملاقات تحریک آزادی سے جڑے ہوئے ان ادیبوں اور دانشوروں سے نہیں ہوتی جن کا تعلق یا تو سید حا سید ھا کیمونسٹ تحریک سے تھا، یا ان لوگوں سے جو بائیں بازو کے خیالات سے متاثر تھے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کو سمجھتے تھے۔

اس تعلق کی وجہ سے، روز ہونے والی بحثوں کے سبب، دنیا کو ایک نظریہ سے دیکھنے کی شروعات نے فیض کی شاعری پر بہت اثر ڈالا۔ فیض کی شاعری نے، جو بھی اپنے شروعاتی دور میں ہی تھی، بڑی تیزی سے اپنی شکل بدلی اور وہ اب ذاتی سروکاروں کے بجائے مجموعی یا سماجی سروکاروں کی شاعری میں تبدیل ہونے لگی۔ وہ نیا نظریہ جو فیض کی شاعری کا اب زندگی پرور نظریہ بن چکا تھا، اس نے اُن کو سماج میں فنکار کے مقام اور اس کے فرائض کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا۔ 1936 میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی لکھنؤ میں بنیاد پڑی اور فیض اس کی پنجاب صوبائی کمیٹی کے سکریٹری چُنے گئے۔

فیض کی شاعری کا پہلا مجموعہ 'نقشِ فریادی' 1941 میں چھپا اور نور جہاں نے، جو اس وقت کی سب سے مشہور مغنّی تھیں، فیض صاحب سے اجازت مانگی کہ وہ اس مجموعہ کی ایک نظم 'مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ' گانا چاہتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اس نظم کو سب سے پہلے گانا چاہتی تھیں۔ فیض صاحب سے اجازت ملنے کے بعد انہوں نے جلد ہی اُسے گایا اور جلد ہی فیض صاحب کو سنایا بھی، قصہ مشہور ہے کہ فیض صاحب نے کہا کہ آج سے یہ غزل ہماری نہیں آپ کی ہو گئی ہے۔

نور جہاں کی آواز میں جب یہ نظم عوام تک پہنچی تو سب نے سُنی۔ نور جہاں جو ملکۂ ترنم کہلاتی تھیں 1940 کی دہائی میں اور اس کے بعد بھی لمبے عرصے تک غزل اور گیت گانے والیوں میں سُپر سٹار تھیں۔

فیض کی شاعری ایک نئی طرز کی شاعری تھی، ایک ایسی شاعری جو اردو شاعری کی روایاتی زبان کا استعمال کرتے ہوئے ایک نئی بات کہہ رہی تھی، کچھ اس انداز سے کہ اس روایتی زبان اور شاعری کے روایتی محاورے کو نئے معنی مل رہے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سے جڑے ہوئے بہت سے

دوسرے شاعر جو غزل کے میدان کو محدود اور نئے خیالوں کے اظہار کے لیے ناکافی سمجھ رہے تھے انھیں یہ احساس ہونے لگا کہ غزل میں ابھی گنجائش ہے۔ یہ احساس بہت حد تک فیض کی شاعری کی دین ہے۔ غزل کے میدان میں جو کام فیض نے کیا وہ کافی حد تک ترقی پسند شاعری میں غزل کو دوبارہ عزّت کا مقام دلانے کے لیے ذمہ دار ہے اور فیض کو غیر معمولی ہر دلعزیز بنانے میں بھی۔

نور جہاں کی گائی ہوئی اس نظم میں جو بات کہی گئی تھی وہ شاید اردو شاعری میں نہیں کہی گئی تھی، کم سے کم اتنے صاف انداز میں تو نہیں کہی گئی ہوگی۔ پیار کرنے والا اپنی محبوبہ سے کہتا ہے:

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

سننے والوں میں سننے کی خواہش جاگی، فیض کی سیاسی زندگی کے لگاتار اتار چڑھاؤ، اپنے خیالوں، اپنے نظریات پر قائم رہنے کی ان کی طرف، مدھم مدھم سروں میں مگر صاف آواز میں بنا لاگ لپیٹ کے اپنی بات کہنا، بار بار لمبی لمبی سزائیں کاٹنا اور ہر بار جیل سے نکلتے ہی اپنی شاعری کا ایک اور مجموعہ عوام کے سامنے لے آنا، ایسی باتیں تھیں جن کی وجہ سے عوام میں ان کی مقبولیت لگاتار بڑھ رہی تھی۔

ہندو پاک میں عوام کے حالات تھے، ایک طرف زندہ رہنے کی روز کی جدوجہد اور دوسری طرف عوام کی تکلیفوں سے حکمرانوں کی بے نیازی، ان میں فیض کی شاعری عوام کے غصے اور بے چینی کا آئینہ بن کر ابھر رہی تھی۔ ہندوستان اور پاکستان کے گانے والوں نے فیض کی شاعری کو عوام تک، خاص طور پر ان لوگوں تک پہنچایا جو یا تو اردو پڑھ نہیں سکتے تھے یا اپنی آمدنی سے اتنے پیسے بچا سکتے کہ کتابیں خرید سکیں۔

بیگم اختر نے بہت خوبصورت ڈھنگ سے 'شامِ فراق اب نہ پوچھ' گائی اور مہدی حسن نے 'گلوں میں رنگ بھرے' کو اس طرح گایا کہ فیض صاحب نے ایک بار دلّی میں اس غزل کو سننے کی

فرمائش پر کہا 'بھئی وہ تو ہم نے مہدی حسن کو دے دی ہے، اب اُن سے ہی سن لیجئے! فیض کی کئی غزلیں مہدی حسن نے گائیں۔ مگر وہ لوگ جنھیں فیض کے ہر شعر کے سیاسی پیغام میں ان کی شاعری کے ظاہری مطلب سے زیادہ دلچسپی ہوتی تھی، اور فیض کے چاہنے والوں میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت بڑی ہوتی تھی، انھیں مہدی حسن کے گانے کا انداز زیادہ میٹھا لگتا تھا۔ اتنے میٹھے ڈھنگ سے فیض کو گانا کہ ان کی شاعری کا اصل مقصد ہی دھندلا ہو جائے، ظاہر ہے ان کے کچھ خاص کام کا نہیں تھا، جو فیض کی شاعری کو عوام کی جدوجہد میں، نکڑ ناٹکوں میں، سیاسی جلسوں میں، مزدوروں کے جلوسوں میں، ویتنام کے لڑاکو عوام کی ہمدردی میں کیے جانے والے دھرنوں میں گاتے تھے اور موقعوں پر، ونود ناگپال نے، صفدر نے، کاجل گھوش نے، اپٹا (IPTA) نے، جن ناٹیہ منچ نے اور بہت سارے اور لوگوں نے فیض کی شاعری کو اپنی ضرورتوں کے مطابق نئی دھنوں میں ڈھالا اور گایا۔

یہی وہ دور تھا جس میں پاکستان میں گانے والوں کی ایک نئی پیڑھی نے فیض کو گانا شروع کیا اور ان میں اقبال بانو، فریدہ خانم، ٹینا ثانی، نیرہ نور کے نام سب سے آگے آتے ہیں۔ فیض کو گانے والوں کی یہ وہ پیڑھی ہے جس نے فیض کی شاعری کو گانے کی شروعات کی، جس کے سیاسی تیور سب سے تیکھے ہیں، جیسے 'ہم دیکھیں گے'، 'ایرانی طلبا کے نام'، 'انتساب' وغیرہ اسی دور میں فیض کی آزاد شاعری جیسے 'تم میرے پاس رہو' کو گانے کی ابتدا کی۔

اسی پیڑھی کے گانے والوں میں نیرہ نور کی آواز سب سے زیادہ سریلی اور میٹھی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ مہدی حسن کی طرح نیرہ نور کی آواز بھی اس تیور کی شاعری کو راس نہیں آتی جس تیور کی شاعری فیض صاحب کرتے تھے۔ اس کے باوجود کہ فریدہ خانم نے فیض صاحب کی چند غزلیں، خاص طور پر 'نہ گنواؤ ناوک نیم کش' بہت خوبصورت ڈھنگ سے ادا کی ہیں۔

اس دور کے گانے والوں میں اقبال بانو کا نام سب سے اوپر آتا ہے۔ جس وقت پاکستان پر ضیاء الحق کی تاناشاہی تھی فیض صاحب پاکستان آ نہیں سکتے تھے اور ان کی شاعری گانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ایسے وقت فیض کی یوم پیدائش پر لاہور میں ایک میٹنگ میں اقبال بانو نے جو نظم گائی،

اس وقت جو سماں تھا اس کا اندازہ اس میٹنگ کی ویڈیو ریکارڈنگ دیکھ اور سن کر ہی لگایا جا سکتا ہے۔ ہر شعر پر انقلاب زندہ آباد کے نعرے لگ رہے تھے، ہزاروں لوگ تالیاں بجا رہے تھے اور اقبال بانو کے ساتھ گا رہے تھے۔

اچھی شاعری ایسی شاعری جو عوام کی خواہش کا آئینہ ہو، کتنا جادوئی ہو سکتی ہے اگر اسے اس ڈھنگ سے گایا جائے جس ڈھنگ کی ادائیگی کی اُسے ضرورت ہے۔ اس کی بہترین مثال فیض میلے میں اقبال بانو کی گائی ہوئی وہ نظم ہے۔

ابھی فیض کی بہت ساری شاعری کو گایا جانا باقی ہے، اور فیض کی بہت سی شاعری کو دوبارہ بدلتے ہوئے وقت کی ضرورتوں کے مطابق گایا جانا بھی ضروری ہے۔ فیض کی شاعری، غالب کی شاعری کی طرح ہر اچھی شاعری کی طرح ہر وقت کے لیے نئے معنی لے کر آتی ہے۔ فیض کی شاعری تو کئی سو سال تک گائی جائے گی، اس کے بارے میں لکھنے کے وقت کی تو ابھی شروعات ہوئی ہے۔

وہ بات سارے فسانے میں جسکا ذکر نہ تھا*

کانتی موہن

راول پنڈی سازش کے نام سے میجر جنرل اکبر خاں اور دیگر افراد پر جو مقدمہ 1951 میں شروع ہوا وہ فیض کی ذاتی اور شعری زندگی میں اہم مقام رکھتا ہے۔ اکبر خان کے ساتھ جو دیگر ملزم اس کیس میں شامل تھے ان میں پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض بھی شامل تھے اور ان دونوں کو چار سال قید کی سزا سنائی گئی تھی۔

مقدمہ کتنا اہم تھا اور جرم کتنا سنگین، اس کا اندازہ پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے ذریعے 9 مارچ 1951 کو ریڈیو پاکستان سے نشر کیے گئے اعلان سے لگایا جا سکتا ہے۔ غور طلب ہے کہ یہ کام کسی اور وزیر وغیرہ پر نہ چھوڑ کر وہ خود ریڈیو اسٹیشن پہنچے: انہوں نے بتایا کہ سرکار کا تختہ پلٹنے کی ایک سازش کا پتہ چلا ہے اور ایسا ارادہ رکھنے والے ان چار لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے: چیف آف جنرل اسٹاف میجر اکبر خاں اور ان کی بیوی نسیم اکبر خاں، بریگیڈیر محمد عبداللطیف خاں اور فیض احمد فیض۔ انہوں نے گرفتار لوگوں کے منصوبے کے بارے میں عام طور پر کچھ کہنے سے انکار کیا اور اس راز کو قومی حفاظت کے حق میں ضروری بتایا۔ انہوں نے اس بات پر ضرور زور دیا کہ سازش کرنے والے

---

* راول پنڈی 'سازش' کیس کا پورا قصہ

پاکستان کی صورتحال کو تشدد سے نیست و نابود کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ یہ سازش پاکستان کی جمہوریت کے خلاف تھی۔ اس کا مقصد انتشار (انارکی) پیدا کرنا، فوجی یکجہتی کو توڑنا اور سامراجی فوجی تانا شاہی قائم کرنا تھا۔ وزیراعظم نے ملک کی عوام سے اس سازش کو ناکام بنانے میں پاکستانی حکومت سے تعاون کرنے کی اپیل کی تھی۔

اس وقت فیض انگریزی اخبار 'پاکستان ٹائمس' کے مدیر اعلیٰ اور اردو روزنامہ امروز کے مینیجنگ ایڈیٹر تھے اور لیاقت سرکار کی پالیسیوں کے بیباک نقاد۔ جمہوریت کے نام پر پاکستان میں ایک عجیب سا نظام وجود میں آگیا تھا۔ 1948 میں پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی قائم ہو چکی تھی اور وہ جائز طور سے عوامی تنظیموں کی مدد سے ملک کی سیاست کی اہم دھارا میں شامل ہونا چاہتی تھی، لیکن سرکار ہر ممکن طریقے سے اس میں رکاوٹ ڈال رہی تھی۔ اس نے پارٹی کے لیے کھلے عام کام کرنا ناممکن بنا دیا تھا، پارٹی اور عوامی تنظیموں کے کارکنان کو جیل میں ڈال دیا تھا اور ان پر جھوٹے مقدمے قائم کر دیئے تھے۔ پارٹی کے جنرل سکریٹری سجاد ظہیر اور مرکزی کمیٹی کے سبھی ممبر انڈر گراؤنڈ ہو گئے تھے اور غیر قانونی طور پر اپنا کام انجام دینے پر مجبور کر دیئے گئے تھے۔ بائیں بازو پاکستان ٹائمس اس زمانے کا بہت اہم اخبار تھا اور جمہوریت کے حق میں رائے عامہ تیار کرنے میں اہم رول انجام دے رہا تھا۔ فیض کمیونسٹ پارٹی کے کھلے جانبدار تھے اور کامریڈ سجاد ظہیر کے پکے دوست۔

فیض کو 9 مارچ 1951 کے دن علی الصبح گرفتار کیا گیا تھا اور اگلے ہی دن پنجاب میں اسمبلی کا چناؤ ہونے والا تھا۔ جب مسلح پولیس انہیں گرفتار کرنے پہنچی تو فیض اور ان کے معاون مظہر علی کو یہی لگا تھا کہ چناؤ سے دور رکھنے کے لیے ہی انہیں جیل لے جایا جا رہا ہے اور الیکشن کے فوراً بعد چھوڑ دیا جائے گا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انہیں پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔ فیض کے خلاف 1818 کے بدنام بنگال ریگولیشنس کے تحت وارنٹ جاری کیا گیا تھا اور انہیں مقدمہ چلائے بغیر غیر یقینی مدت کے لیے حراست میں لے لیا گیا تھا۔

میجر جنرل اکبر خاں راول پنڈی سازش کیس کی دُھری (محور) تھے۔ 1948 میں کشمیر کو لے

کر ہوئے ہند پاک تنازع کے دوران وہ پاکستانی فوج کی قیادت کر رہے تھے۔ ان دنوں وہ بریگیڈیر کے عہدے پر کام کر رہے تھے اور پاکستانی فوج میں انہیں 'جنرل طارق' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ کشمیر میں پاکستان کی سیاست یہ تھی کہ سب سے پہلے تو کچھ پٹھان قبائلیوں سے وہاں گھس پیٹھ کرائی جائے، پھر فوج کے ایک حصے کو قبائلی بھیس میں وہاں اتار دیا جائے اور ان کے پیچھے پاک فوج کی مدد سے کشمیر پر قبضہ کر لیا جائے۔ اُنھیں امید تھی کہ ہندو راجا کی ہندوستان میں وِلے (شمولیت) کی کوشش کے باوجود وہاں کی بھاری مسلم آبادی پاکستان کی فوج کا استقبال کرے گی اور کشمیر پر قبضہ کرنے میں کوئی بڑی رکاوٹ نہیں آئے گی۔ بعد کی باتیں تو تاریخ کی ہیں، مختصر بات یہ ہے کہ اکبر خاں کشمیر سے شکست کھا کر لوٹے اور اپنی اس پسپائی کو وہ زندگی بھر نہیں بھولے۔

انہیں لگا کہ انہیں لام پر بھیجنے کے بعد پاکستانی حکومت کو پیچھے سے ان کی جیسی مدد کرنی چاہیے تھی، ویسی نہیں کی گئی اور ان کی شکست اسی سبب ہوئی۔ وہ کشمیر میں جنگ بندی کے مخالف تھے اور اپنی بریگیڈ کے بل پر سرینگر کو جیتنے کا خواب دیکھتے تھے۔ بعد میں جو نہرو-لیاقت سمجھوتہ ہوا، اسے بھی اکبر خاں نے ایک بے شرم جھکنے والی حرکت ہی مانا۔

اس موضوع کو طول دینا بیکار ہے، لیکن راول پنڈی سازش کیس کے سلسلے میں اس کی اہمیت کو لے کر یہ دُہرانا ضروری ہے کہ اگر کشمیر میں یہ فوجی پہل ناکامیاب نہ ہوئی ہوتی اور اُس وقت اس منصوبے کو عاید کرنے کی کمان اکبر خاں کے ہاتھ میں نہیں رہی ہوتی تو شاید یہ کیس بھی وجود میں نہ آیا ہوتا۔

اس میں شک نہیں کہ اکبر خاں ایک دلیر سپاہی تھے۔ وہ جنگ میں ہارنے کے عادی نہ تھے اور اپنی پہلی ہار کو آسانی سے نہیں بھول سکتے تھے۔ انہیں لگا کہ پاکستان میں لیاقت علی خاں کی حکومت تو گلے سڑے گیہوں کی بوری ہے، جسے پلٹ دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ ملک کے عوام کشمیر میں شرمناک ہار کے لیے بھی اسی کو ذمہ دار مانتے ہیں اور اگر ایسی نکمی اور نالائق سرکار کا تختہ پلٹنے کی کوئی کوشش کی جائے تو اس کی مخالفت شاید ہی کسی طرف سے ہو۔ اب ضرورت تھی تو کچھ ایسے ساتھیوں کی جو سرکار

سے ناراض اور پریشان ہوں اور جن کا ساتھ تختہ پلٹنے والوں کو اخلاقی تعاون دلا سکے۔

یہ سچ ہے کہ پاکستانی فوج میں اکبر خاں کے ہم خیال اور لوگ بھی تھے۔ فوجی افسران کا اچھا خاصا حصہ کشمیر میں جنگ بندی سے ناراض اور ناخوش تھا اور حکومت کے خلاف اکبر خاں کے ساتھ کھڑا ہونے کے لیے تیار تھا۔ راول پنڈی سازش کیس میں جن لوگوں پر مقدمہ چلایا گیا ان میں میجر جنرل اکبر خاں کے علاوہ کیپٹن سے لے کر بریگیڈیر تک کے عہدوں پر کام کر رہے کم سے کم سات فوجی و ہوائی افسران شامل تھے۔ ہندوستان میں کم لوگ جانتے ہیں کہ اس معاملے میں فوج کے ایک بڑے اور سینئر جنرل نظیر احمد کو بھی حراست میں لے کر پوچھ تاچھ کی گئی تھی۔ ان دنوں وہ میجر جنرل کے عہدے پر کام کر رہے تھے۔ ان پر الزام تھا کہ سازش کی بھنک ہوتے ہوئے بھی انہوں نے یہ بات اپنے تک ہی محدود رکھی، اپنے سے اعلیٰ افسران تک نہیں پہنچائی۔ انہیں قصوروار پایا گیا اور ایک دن کی سزا سنائی گئی۔ سزا سنانے کے فوراً بعد عدالت اٹھ گئی۔

فوجی افسران کے علاوہ اکبر خاں کی نظر پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی پر بھی گئی، جو پاکستان کی موجودہ سرکار کی زیادتیوں کا سب سے بڑا شکار تھی اور جسے نئی حکومت آنے کے بعد کچھ رعایتیں دینے کے وعدہ پر اپنے ساتھ لیا جا سکتا تھا۔ اکبر خاں اپنی بیوی کو بہت مانتے تھے اور اپنے ہر راز میں انہیں شریک کرتے تھے۔ بیگم نسیم، سر محمد شفیع کی بیٹی اور مسلم لیگ کی ایک بہت بڑی نیتا بیگم جہاں آرا شاہنواز کی بیٹی تھیں اور ملک کے بڑے بڑے سیاست دانوں، دانشوروں اور اعلیٰ افسروں سے ان کے تعلقات تھے، جن میں فیض احمد فیض بھی شامل تھے۔ فیض کا ساتھ اکبر خاں کے لیے بے حد مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ ایک تو ان کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری سجاد ظہیر سے بے تکلفی اور دوستی تھی اور دوسرے وہ ایک بڑے اور اہم اخبار پاکستان ٹائمس کے مدیر اعلیٰ تھے اور یہ اخبار تختہ پلٹ جانے کے بعد وجود میں آنے والے فوجی نظام کے حق میں رائے عامہ تیار کرنے میں ایک بڑا کردار نبھا سکتا تھا۔

لہٰذا 23 فروری 1951 کو میجر جنرل اکبر خاں کی کوٹھی پر 'ہم خیال' لوگوں کی ایک میٹنگ بلائی گئی اور اس میں اکبر خاں نے تختہ پلٹنے کا اپنا منصوبہ پیش کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ میٹنگ میں ان لوگوں

نے حصہ لیا: اکبر خاں، نسیم اکبر خاں، بریگیڈیر محمد عبداللطیف خاں، ایئر کمانڈر محمد خان جنجوا، لیفٹیننٹ کرنل صدیق راجا، میجر ایم یوسف سیٹھی، میجر محمد اسحاق، کیپٹن ظفر اللہ پوشنی، سید سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، محمد حسین عطا۔ کچھ حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے علاوہ سید سبط حسن، ریل مزدوروں کے محبوب رہنما مرزا محمد ابراہیم، دادا فیروز الدین منصور، ایرک سائپرین اور حسن عابدی بھی میٹنگ میں شامل تھے، جبکہ دیگر حوالے اس کی وضاحت نہیں کرتے۔ ہاں، یہ طے ہے کہ راول پنڈی سازش کے معاملے میں ان میں سے تقریباً سبھی کو گھسیٹا گیا تھا اور ان پر مقدمے چلائے گئے تھے۔ لیاقت علی خاں کی سرکار اتنی غیر محفوظ محسوس کرتی تھی کہ اس نے محمد ندیم قاسمی جیسے معزز ادیب کو بھی صرف اس لیے چھ مہینوں کے لیے نظر بند کر دیا کہ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری تھے۔ یہ سبھی اگلی صف کے کمیونسٹ تھے یہ ہم پورے ثبوت کے ساتھ نہیں کہہ سکتے لیکن عوامی سرگرمیوں یا کارگزاریوں میں سرگرم تھے، حالانکہ ان میں سے بیشتر لوگوں کا راول پنڈی سازش سے قطعی کوئی تعلق نہ تھا۔

راول پنڈی میں چیف آف آرمی اسٹاف کی کوٹھی پر بلائی گئی اس بیٹھک میں اکبر خاں نے اپنا منصوبہ پیش کیا۔ گورنر جنرل جناح کی موت کے بعد خواجہ ناظم الدین نے عہدہ سنبھالا۔ نو وارد گورنر جنرل اور وزیر اعظم لیاقت علی خاں اگلے ہفتے راول پنڈی آنے والے تھے۔ تجویز تھی کہ یہاں ان دونوں کو گرفتار کر لیا جائے اور گورنر جنرل کو مجبور کیا جائے کہ وہ لیاقت سرکار کو برخاست کر دیں۔ اس کی برخاستگی کے بعد اکبر خاں نئی سرکار تشکیل کر لیں گے اور ملک میں فوج کی نگرانی میں عام چناؤ کرا دیں گے، حالانکہ اس کی کوئی تاریخ نہیں بتائی گئی تھی۔ نئی سرکار کمیونسٹ پارٹی کو سیاست کے میدان میں کھل کر کام کرنے کا موقع فراہم کرے گی اور بدلے میں کمیونسٹ پارٹی نئی سرکار کی حمایت کرے گی۔ فیض احمد فیض کی ادارت میں پاکستان ٹائمس اور اردو روزنامہ امروز اپنی ادارتی نظریہ سے نئی سرکار کا تعاون کریں گے۔

یہ ایک خفیہ نشست تھی اور اس کی کارروائیوں کو دستاویزوں کی مدد سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

بیٹھک کے حصہ داروں کی کہی سنی باتوں کے مطابق، اور کمیونسٹ پارٹی کی ریت یا پالیسی وفیض کے خیالات کے جائزے کی مدد سے یہ اندازہ ہی لگایا جاسکتا ہے کہ میٹنگ میں دراصل کیا بات چیت ہوئی ہوگی۔ میٹنگ آٹھ گھنٹے چلی اور پھر بنا کسی نتیجے پر پہنچے برخاست ہوئی، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس تجویز پر اہم تبادلۂ خیال ہوا ہوگا۔ اکبر خاں کی شہرت ایک جانباز اور صاف گو لیکن مغرور جنرل کی تھی اور کمیونسٹ پارٹی کے پاس یہ جاننے کا کوئی طریقہ نہ تھا کہ بری، فضائی اور بحری فوج سے وہ واقعی کتنا تعاون حاصل کر پائیں گے۔ یہ سوال بھی قابل غور تھا کہ جب ایک بار پاک فوج کا اتحاد ٹوٹ جائے گا اور وہ گروپوں میں منتشر ہو جائے گی تو کون سا گروپ نئی سرکار کے ساتھ آئے گا اور کون سا اس کے خلاف کام کرے گا؟ پارٹی کی طرز سے واقف لوگ بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ کسی بیٹھک میں پارٹی کے نیتاؤں کی موجودگی بھی اس بات کو یقینی نہیں کر سکتی ہے کہ وہ پارٹی کی موت وزندگی سے متعلق کسی سوال پر جلد بازی سے کوئی فیصلہ لے سکیں۔ ایسے کسی بھی سوال پر بھی پارٹی کی اعلیٰ کمیٹیوں کو اعتماد میں لے کر متعلق تجاویز پر ان کی رائے لینا کمیونسٹوں کی کارکردگی کا عنصر تھا۔ اکبر خاں کی اسکیم میں مشرقی پاکستان کا کوئی ذکر نہ تھا۔ اکبر خان کے برعکس کمیونسٹوں کے لیے یہ مان لینا آسان نہیں رہا ہوگا کہ اکیلے مغربی پاکستان میں تختہ پلٹنا کافی ہے، مشرقی پاکستان کی عوام کے پاس اس کی پیروی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ جائے گا۔ پارٹی اس سچائی کو کیسے نظرانداز کر سکتی تھی کہ پاکستان کے عوام کی اکثریت مغرب میں نہیں بلکہ مشرقی پاکستان میں رہتی ہے اور مغرب کے مقابلے جہاں جمہوریت کی جڑیں نسبتاً گہری ہیں۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ جب یہ بھی جانی مانی بات تھی کہ اکبر خاں اپنی بیگم کو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی مانتے تھے جبکہ ان کی شخصیت ایک بیحد ایمبیشش (ambitious) اور بڑبولی عورت کی تھی، ایک متوازن و باشعور خاتون کی نہیں۔ وہ اپنی اس اہمیت کو چھپانے میں یقین نہیں رکھتی تھیں کہ انہیں کسی بھی طرح ایک دن ملک کی اوّل خاتون (first lady) بن کر دکھانا ہے۔ ایسے میں، فوجی سازش کو کمیونسٹ پارٹی کے تعاون کی بات کیسے اور کب تک خفیہ رہ سکتی تھی؟

دراصل، بیگم نسیم اکبر خاں ملک کی 'فرسٹ لیڈی' بننے کی کچھ زیادہ ہی جلدی میں تھیں اور اس بات پر مطمئن ہو چکی تھیں کہ اب انہیں اپنا ارادہ پورا کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ ٹیلی فون پر اپنی سہیلیوں کو یہ بتانے میں مصروف ہوگئیں کہ تجویز کردہ تختہ پلٹنے کے بعد ان کے کیا منصوبے تھے۔ اس کے علاوہ، عسکر علی شاہ نامی ایک پولیس افسر نے بھی اس راز کو فاش کرنے میں ایک بڑا کردار ادا کیا۔ وہ اکبر خاں کا بھروسے مند تھا اور اگر چہ وہ 23 فروری کی بیٹھک میں موجود نہ تھا، لیکن خود جنرل اکبر خاں کی مہربانی سے سب احوال جانتا تھا۔ اس نے اس وقت تک جنرل کے ساتھ کبھی دغا نہیں کی تھی، لیکن اس بار تجویز اتنی بڑی تھی کہ وہ اسے اپنے پیٹ میں نہ رکھ سکا اور اس نے ساری بات اپنے انسپکٹر جنرل آف پولیس کو بتادی اور وہ سیدھا شمال۔ مغربی علاقے کے گورنر کے پاس پہنچا اور اکبر خاں کا سارا منصوبہ اسے بتادیا۔ گورنر نے پلک جھپکائے بغیر یہ بات وزیر اعظم تک پہنچادی۔ اور اس طرح پاکستان کے فوجی تختہ پلٹوں کی تاریخ میں اس پہلی کوشش کو ناکام بنادیا گیا۔

پہلے دن، یعنی 9 مارچ 1951 کو چار اہم ملزموں کو پکڑا گیا جن میں فیض شامل تھے۔ اسی دن وزیر اعظم نے خود ریڈیو کے ذریعہ اس سازش سے ملک کی عوام کو خبردار کیا۔ دھیرے دھیرے سبھی ملزم پکڑے گئے۔ صرف کامریڈ محمد حسین عطا انڈر گراؤنڈ ہو گئے اور ایک مہینے تک پولیس کو چھکاتے رہے۔ اخیر میں انہیں مشرقی پاکستان سے پکڑا گیا۔ پارٹی کے جنرل سکریٹری سجاد ظہیر پہلے سے ہی روپوش تھے اور کئی مہینے بعد ہی انہیں گرفتار کرنا ممکن ہوا۔ زیادہ تر ملزموں کو لاہور کی مختلف جیلوں میں رکھا گیا اور اخیر میں ان سب کو سندھ علاقے کی حیدرآباد جیل لے جایا گیا۔ وہاں جیل کے اندر ایک خاص احاطہ کو نئے سرے سے درست کر کے اسے ایک عدالت کی شکل دی گئی اور ملزموں پر مقدمہ چلانے کے لیے ایک اسپیشل ٹرائبونل تشکیل کیا گیا۔ یہ تین ممبروں پر مشتمل ٹریبونل فیڈرل کورٹ کے جسٹس سر عبدالرحمٰن کی صدارت میں بنایا گیا اور اس میں پنجاب ہائی کورٹ کے جسٹس محمد شریف اور ڈھاکہ ہائی کورٹ کے جسٹس امیر الدین کو شامل کیا گیا تھا۔

فیض کو شروع کے مہینوں میں سرگودھا اور لائل پور جیلوں میں قید تنہائی یا کال کوٹھری میں رکھا

گیا۔ انہیں پڑھنے لکھنے کی سہولتوں سے محروم کیا گیا اور ان کا کوئی رشتہ دار یا دوست ان سے نہیں مل سکتا تھا۔ اس سختی کا سبب غالباً یہ تھا کہ ابھی تک کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری سجاد ظہیر پر دباؤ بنانے کے لیے انہیں تکلیف دہ قید تنہائی میں رکھا گیا۔ سجاد ظہیر کی گرفتاری کے بعد ہی سب ملزموں کو حیدرآباد جیل لے جایا گیا اور ان پر مقدمہ چلانے کی تیاریاں مکمل کرلی گئیں۔ اس سے صاف ہو جاتا ہے کہ پاکستانی حکومت صرف اکبر خاں اور ان کے ساتھیوں پر مقدمہ چلا کر مطمئن نہیں ہونا چاہتی تھی، سامراجی آقاؤں کی تسلی کے لیے پاکستانی کمیونسٹ پارٹی پر غداری کے الزام میں مقدمہ چلانا اور سزا دلانا ضروری تھا۔

اس سے پہلے پاک اسمبلی نے 16 اپریل 1951 کو راول پنڈی سازش کو دھیان میں رکھتے ہوئے ایک قانون پاس کر دیا تھا جس کا موضوع 'راول پنڈی (اسپیشل ٹریبونل) ایکٹ 1951' تھا۔ مذکورہ ٹریبونل اسی ایکٹ کے تحت قائم کیا گیا تھا۔ ٹریبونل کے تینوں ممبروں کے لیے ضروری تھا کہ وہ فیڈرل کورٹ یا ہائی کورٹ میں عہدہ پر فائز جج ہوں۔ اسے ہائی کورٹ کی ساری طاقت اور حقوق دیے گئے تھے، بلکہ اس معنیٰ میں وہ ہائی کورٹ سے بھی اوپر تھا کہ ملک کی کسی بھی عدالت میں اس کے فیصلے کے خلاف سُنوائی ہو سکتی تھی۔ ٹریبونل کی کارروائی خفیہ تھی اور سُنوائی کے دوران عوام عدالت میں نہیں آسکتے۔ اس سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملزموں اور ان کے وکیلوں اور معاونین کی یہ بات پوری طرح درست تھی کہ اس معاملے میں فطری انصاف (Natural Justice) کے کم از کم پیرامیٹر (پیمانے) بھی لاگو نہیں کیے جا رہے تھے۔

مقدمے کی سُنوائی 15 جون 1951 کو صبح آٹھ بجے شروع ہوئی۔ سرکار کی نمائندگی مشہور وکیل اے کے بروہی کر رہے تھے۔ آگے چل کر یہ حضرت تاناشاہوں سے اپنی نزدیکیوں کے چلتے خاصے بدنام ہوئے، لیکن ان کی قانونی اہلیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بریگیڈیر لطیف کی جانب سے مشہور و معروف وکیل اور سیاستداں حسین شہید سہراوردی کھڑے ہوئے اور جنرل اکبر کی پیروی مشہور وکیل زیڈ ایچ لاری نے کی۔ جن دیگر اہم وکیلوں نے مقدمے میں ملزموں کے بچاؤ میں حصہ لیا

ان میں ملک فیض محمد، خواجہ عبدالرحیم، صاحبزادہ نوازش علی اور قاضی اسلم کے نام اہم ہیں۔ سبھی ملزموں کے خلاف بنیادی الزام یہ تھا کہ انہوں نے بادشاہ (کنگ) کے خلاف جنگ چھیڑنے کا جرم کیا ہے۔ موٹے طور پر یہ جرم وطن سے غداری کرنے جیسا تھا اور ثابت ہونے پر مجرموں کو سزائے موت تک دی جاسکتی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جتنے دن یہ مقدمہ چلا، ملزموں اور ان کے گھر والوں کے سر پر سزائے موت کی تلوار لٹکتی رہی۔ اس سے فیض کی بیوی ایلس فیض کے حالات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو پاکستان ٹائمز میں نوکری کر کے کسی طرح اپنا اور اپنی دو ننھی بیٹیوں کا پیٹ پال رہی تھیں۔ مقدمے کا خرچ اٹھا رہی تھیں اور تمام دوڑ دھوپ کر رہی تھیں۔ جیسے جیسے مقدمہ طول پکڑتا گیا، ملزموں کا ہاتھ تنگ ہوتا گیا اور محنتانہ نہ مل پانے کی صورت میں وکیل انہیں الوداع کہنے لگے۔ جنرل اکبر اور بریگیڈیر لطیف کو نوکری سے پہلے ہی برخاست کر دیا گیا تھا، کمیونسٹ تو اپنے کڑکے پن کے لیے مشہور ہیں ہی لیکن وکیلوں کی چلا چلی کی اس بیلا میں بھی حسین شہید سہراوردی ہمالیہ کی طرح اٹل رہے اور بغیر محنتانہ کے پوری مستعدی کے ساتھ اپنے مؤکل کی پیروی کرتے رہے۔

حق استغاثہ کی جانب سے کہا گیا کہ ملزمان نے پاکستان میں قانون کے ذریعے قائم کی گئی حکومت کو مجرمانہ طریقوں سے الٹنے کی 'سازش' رچی۔ ملزموں نے 'سازش' کی بات سے انکار کیا۔ اب ساری بات اس نقطے پر آکر ٹک گئی کہ سرکاری وکیل کی طرف سے جو ثبوت پیش کیے گئے ہیں وہ سازش ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں یا نہیں؟ گویا، عدالت کو دیکھنا ہوگا کہ کیا سرکار کا تختہ پلٹ کر دینے کی سازش واقعی کی گئی ہے؟ اور اگر سازش کی گئی تو پھر ان میں کون کون شامل تھا؟ سرکاری وکیل کی طرف سے جو ثبوت پیش کیے گئے ان میں سب سے اہم دو اقبالی گواہ تھے: لیفٹیننٹ کرنل صدیق راجا اور میجر ایم یوسف سیٹھی۔ یہ دونوں 23 فروری کو اکبر خاں کے گھر پر ہوئی میٹنگ میں موجود تھے اور اب سزا سے بچنے کے لیے اقبالیہ گواہ بن گئے تھے۔ ان کے علاوہ دیگر گواہ بھی تھے، لیکن وہ جائے واردات پر موجود نہیں تھے اور ان کی گواہی صرف یہ بتا سکتی تھی کہ حالات ایسے تھے کہ ملزم سازش رچ سکتے تھے۔ اقبالیہ گواہوں نے زور دے کر گواہی دی کہ 23 فروری کی بیٹھک سرکار کا تختہ

پلٹنے کا فیصلہ لینے کے بعد ہی برخاست ہوئی تھی۔ ملزموں نے بیٹھک یا بیٹھک میں حاضر ہونے سے انکار نہیں کیا، ان کا زور اس بات پر تھا کہ بحث و مباحثہ کے بعد بیٹھک بغیر کسی نتیجہ پر پہنچے سے ہی برخاست کر دی گئی تھی۔ یہ مدعا اس لیے مرکزی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ تعزیراتِ پاکستان کے مطابق سازش ثابت کرنے کے لیے یہ لازمی تھا کہ دو یا دو سے زیادہ لوگوں کے درمیان جرم کرنے یا جائز کام کو ناجائز طریقوں سے کرنے پر متفق ہوں۔ ایسی واضح قبولیت کے بغیر کسی کو قانون کے ذریعے قائم کی گئی سرکار کا تختہ پلٹنے کی سازش رچنے کا مجرم نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔

سچ 'ملزموں' کے ساتھ تھا۔ سچائی یہی تھی کہ بیٹھک ہوئی تھی اور ایک لائحہ عمل کو لے کر بلائی گئی تھی۔ میجر جنرل اکبر خاں نے سازش کی تجویز باقاعدہ پیش کی۔ آٹھ گھنٹے تک اس کے الگ الگ پہلوؤں پر گرما گرم بحث مباحثہ بھی ہوا، لیکن آخر کار کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا اور بیٹھک بغیر کسی فیصلے کے برخاست ہو گئی۔ فیض کی دوست اور ان کے حالاتِ زندگی کی مصنف لدملا تسیلیوا کا دعویٰ ہے کہ کمیونسٹ نمائندوں نے جنرل اکبر خاں کے منصوبے کو بچکانا کہہ کر رد کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان کی عوام ایسے کسی قدم کے لیے تیار نہیں ہے اور نہ پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی ہی اس حالت میں ہے کہ کسی وجہ سے کامیابی کی صورت میں ملک کی رہنمائی کی ذمہ داری نبھا سکے۔ کئی حوالوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کمیونسٹوں نے میجر جنرل اکبر خاں کی اسکیم کو خیالی پلاؤ بتا کر اسے خارج کر دیا۔ 'ملزموں' کے وکلا کا اصرار تھا کہ 'ملزموں' کے بیچ جب کوئی اتفاق ہوا ہی نہیں، کوئی فیصلہ ہوا ہی نہیں، کسی یقینی اسکیم کو لاگو کرنے کا تہیہ کر کے میٹنگ برخاست ہی نہیں ہوئی تو سازش رچنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟ ملزموں میں سے کچھ پر دباؤ ڈال کر، ڈرا دھمکا کر یا لالچ دے کر ان میں سے دو ایک کو اقبالیہ گواہ بنا لینا اور من چاہا بیان دلا لینا کونسا مشکل کام ہے۔ یہ تو ہماری بڑی عدالتوں میں ہمیشہ ہوتا ہے۔ بیشک جتنے دن مقدمہ چلتا ہے، ملزم اور اس کے گھر والوں کی جان جوکھم میں پھنسی رہتی ہے، لیکن جرم ثابت کرنے کے لیے تو ٹھوس ثبوت چاہئے، ایسے ثبوت جو جرم ثابت کرتے ہوں، جرم میں ملزم کی شرکت ثابت کرتے ہوں اور اس بارے میں کسی قسم کا شبہ نہ چھوڑتے ہوں۔

اصلیت تو یہ ہے کہ یہ ایک سراسر جعلی کیس تھا اور پاکستانی حکمران نے اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے یہ کہانی گڑھ لی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ پچاس کی دہائی میں زور شور سے شروع ہوئی سرد جنگ کی سیاست کے تقاضات اس کے پیچھے کام کر رہے تھے۔ امریکی سامراجیوں کے لیے نو آزاد پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی ایک ایسا خطرہ تھا جسے وہ پیدا ہونے سے پہلے ہی ختم کر دینا چاہتے تھے اور اس میں کیا شبہ ہے کہ لیاقت سرکار ایک حد تک امریکہ کے زیر اثر تھی اور اس کی خوشنودی چاہتی تھی۔

بے شک، پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی وہاں کے عوام کو اس قدر مقبول نہیں تھی کہ وہ اس کے اشارے پر سر پر کفن باندھ کر گھر سے نکل پڑتے، لیکن یہ بھی ٹھیک ہے کہ ٹریڈ یونین، فیڈریشن، اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور انجمن ترقی پسند مصنفین وغیرہ عوامی تنظیمیں وجود میں آ گئی تھیں اور عوام ان کی ابتدائی سرگرمیوں کو دلچسپی کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ بے بنیاد اور ڈھلمل یقین پاک حکمرانوں اور ان کے سامراجی آقاؤں کے لیے اتنا کافی تھا اور انہوں نے نو تشکیل کمیونسٹ پارٹی کو جڑ سے مٹانے پر کمر کس لی۔ کیا اسے محض اتفاق کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے کہ جس پبلک سیفٹی ایکٹ کو رد کرنے کے لیے انجمن ترقی پسند مصنفین نے اپنے سیشن میں تجویز پاس کی تھی، اس کے ایک اہم رہنما فیض کو اسی انسان دشمن قانون کے تحت گرفتار کیا گیا؟ پاک سرکار کی طرف سے عوام کے سامنے اس معاملے کو اس طرح پیش کیا گیا گویا بنیادی طور پر یہ سازش کمیونسٹ سوویت یونین اور اس کے پچھ لگو پاک کمیونسٹوں کی ہو اور انہوں نے اسے کامیاب بنانے کے لیے پاکستانی فوج کے کچھ گمراہ افسران کو بھی اس میں شامل کر لیا ہو۔ پاک پارلیمنٹ میں یہ معاملہ اس طرح پیش کیا گیا کہ اس نے تجویز پاس کر کے عدالت سے ملزموں کو سزائے موت سنانے کی درخواست کی۔ نہ صرف پاکستان کے بلکہ ہندوستان کے بھی کئی اخباروں نے مانگ کی کہ غدار فیض احمد فیض کو موت کی سزا دی جائے۔

اس سلسلے کو ایک اور نقطۂ نظر سے دیکھنا بھی ضروری ہے۔ پاکستان کی فوج میں نہ جانے کتنے جھگڑے چل رہے تھے۔ چیف آف اسٹاف، پھر میجر جنرل اکبر خاں کچھ اعلیٰ فوجی افسروں کی آنکھ کی کرکری بنے ہوئے تھے۔ کشمیری تنازع کے وقت پاکستانی فوج کے کمانڈر ان چیف کا عہدہ انگریز

فوجی افسر جنرل ڈگلس ڈیوڈ گریسی کے پاس تھا اور جن کا اس موضوع پر پاک فوج کی رہنمائی کرنے والے اکبر خاں سے سیاسی سوالوں پر اس کا مت بھید تھا اور اکھڑ اکبر خاں اس پر پردہ ڈالنے میں یقین نہیں کرتے تھے۔ وہ کشمیر پر دھاوا بول کر سیدھے سرینگر تک پہنچے اور پورے کشمیر پر قبضہ کرنے کے حامی تھے، لیکن گریسی تنازعہ کو اس حد تک لے جانے کے خلاف تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عین اس وقت پر ہندوستانی فوج کی اعلیٰ کمان بھی برٹش افسروں کے ہاتھ میں ہی تھی اور ہند۔ پاک جنگ کا مطلب ہوتا ہے کہ دونوں طرف انگریز افسروں کے درمیان جنگ جسے وہ منظور نہیں کر سکتے تھے۔

جنگ بندی ہونے کے بعد اور میجر جنرل بن کر چیف آف اسٹاف کے عہدے پر راولپنڈی آنے کے بعد اکبر خاں کا دماغ اور بھی پھر گیا۔ انہوں نے اپنی نقل و حرکت کے معاملے میں ضروری احتیاط بھی برتنا چھوڑ دیا۔ اب وہ یہ پرواہ بھی نہیں کرتے تھے کہ وہ کس کے سامنے کیا کہہ رہے ہیں۔ بیشک، وہ ایک بارسوخ افسر تھے اور انہیں یقین تھا کہ اعلیٰ فوجی افسروں کے لیے بھی انہیں ہاتھ لگانا آسان نہیں ہوگا۔ آسان تھا بھی نہیں، لیکن اکبر خاں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ان پر ایک عرصے سے نظر رکھی جا رہی تھی۔ اپنی کتاب 'اے فرینڈس ناٹ ماسٹرس' میں جنرل ایوب خاں نے بتایا ہے کہ انہوں نے اکبر خاں کو جنرل ہیڈ کوارٹرس میں چیف آف دی اسٹاف بنا کر بلایا ہی اس لیے تھا کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایک میجر جنرل کی حیثیت سے ایک یا ایک سے زیادہ ڈویژن کے فوجیوں کی سیدھی کمان ان کے ہاتھ میں رہے اور وہ فوج کی مدد سے کسی بڑی سازش کو انجام دے سکیں۔ اس کے علاوہ جنرل ایوب خاں راولپنڈی بلا کر اکبر خاں سے اپنی نگرانی میں کام لے سکتے تھے۔ دیگر حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ راولپنڈی میں اس پر نہ صرف جنرل ایوب کی نظر تھی بلکہ دفاعی سکریٹری اسکندر مرزا بھی اس کی نقل و حرکت سے باخبر رہتے تھے۔ لیکن، پاک فوج کے درمیان اپنی بہادری کی شہرت کی وجہ سے وہ اتنے ہردلعزیز تھے کہ مناسب حالات میں ان کے خلاف کچھ کرنا آسان نہ تھا۔ ان کی مقبولیت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب جمہوریت بحال ہوئی اور ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے وزیراعظم بنے تو انہوں نے جب نیشنل سکیوریٹی آرگنائزیشن قائم کیا تو راول پنڈی 'سازش' کیس

کے سزا یافتہ جنرل اکبر خاں کو اس کا صدر بنایا۔

بہر حال، جب اکبر خاں نے تختہ پلٹ کے امکان تلاش کرتے ہوتے ہوئے پاک فوج میں اپنے مخالفین کو حملہ کرنے کا موقع دے دیا تو انہوں نے اس موقع کو پوری طرح بھنانے کی کوشش کی اور دو وادئ فوجی افسروں کو اپنی طرف ملا کر ان سے من چاہا بیان اگلوالیا۔ یہ بیان ضروری تھا کیونکہ اگر یہ دونوں اقبالیہ گواہ بیٹھک میں متفقہ فیصلہ کی بات نہ کرتے تو سازش کا الزام ثابت نہیں ہو سکتا تھا اور اگر سازش کا الزام ثابت ہو جاتا تو حکمران اکبر خاں اور کمیونسٹوں کو منہ مانگی سزا، یہاں تک کہ سزائے موت بھی، دلا سکتے تھے۔

دراصل، پاکستانی حکمران اور فوج کے اعلیٰ ترین افسران ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے۔ اس سے ایک تو اکبر خاں کو طویل عرصے کے لیے جیل بھیج کر مطمئن ہوا جا سکتا تھا، دوسرے کمیونسٹ پارٹی کو بھی ایک طاقت ور اور مقبول عوامی پارٹی بننے سے پہلے ہی ختم کیا جا سکتا تھا، کیونکہ ان کی تمام کوششوں کے باوجود وہ اپنے عوامی تنظیموں کی مدد سے اپنے اثر کو پھیلانے میں لگی ہوئی تھی اور اسے کچھ نہ کچھ کامیابی بھی مل رہی تھی۔ توجہ دینے کی بات ہے کہ راول پنڈی 'سازش' کیس کا فیصلہ آتے ہی، 1954 میں ہی، پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کو باضابطہ غیر قانونی قرار دیا گیا اور اس کی تمام عوامی تنظیموں کو، یہاں تک کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کو بھی، غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ اب کمیونسٹ پارٹی کو باقاعدہ انڈر گراؤنڈ جانے پر مجبور ہونا پڑا۔

ٹرائی بیونل نے فیصلہ دیا کہ پیش کیے گئے ثبوتوں سے 'بادشاہ' کے خلاف سازش ثابت نہیں ہوتی۔ یہ ثابت نہیں ہوتا کہ 23 فروری 1951 کی بیٹھک کسی لائحہ عمل کو مکمل کرنے کا فیصلہ لے کر برخاست ہوئی تھی۔ پھر بھی اس نے تمام فوجی اور نیم فوجی ملزموں کو چار چار سال کی قید کی سزا سنائی۔ اکبر خاں کو چودہ سال کی سزا سنائی گئی۔ سزا میں سے مقدمے کے دوران ملزموں کے ذریعہ جیل میں گزارا گیا وقت کم کر دیا گیا۔

فیض بیحد سنجیدہ قسم کے انسان تھے۔ انہوں نے والد کے انتقال کے بعد اپنی زندگی میں بھی

بھی انتہائی فارغ البالی تو نہیں دیکھی تھی، لیکن زندگی سے انہیں کوئی شکایت بھی نہ تھی۔ 1941 میں ایلس سے شادی کے بعد ان کی زندگی خوشیوں سے بھر گئی تھی، دو بچیوں نے کی ولادت نے ان کا سکھ دوبالا کر دیا تھا۔ پاکستان ٹائمز کی نوکری انہیں راس آ رہی تھی اور اخبار کے مالک میاں افتخار الدین اور اپنے عزیز دوست مظہر خاں کی صحبت میں وہ بہت خوش تھے۔ 1943 میں ان کا پہلا شعری مجموعہ، نقشِ فریادی، شائع ہو چکا تھا اور قارئین نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا، خاص کر طالب علموں اور نوجوانوں کے درمیان ایک شاعر کی حیثیت سے ان کی عوامی مقبولیت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ ریڈیو، کالجوں اور شہروں میں ہونے والے مشاعروں سے انہیں اپنا کلام پیش کرنے کے بلاوے اکثر آنے لگے تھے۔ ان کی ضرورتیں بہت نہ تھیں اور جو تھیں وہ مزے سے پوری ہو رہی تھیں۔ زندگی اپنی رفتار سے رواں دواں تھی مگر اب مقدمہ و جیل نے رکاوٹ پیدا کر دی اور فیض کو سنجیدہ سوالات پر نئے سرے سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ صحافت کی تگ و دو نے زندگی کی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں نے ان کے قلم سے شاعری کو تقریباً الوداع ہی کر دیا تھا۔ لیکن پھر جیل کی تنہائی اور فرصت میں نئے سرے سے شاعری ان کی محبوبہ بن گئی اور اس حسین ملن نے فیض کو نہ صرف بے پناہ شہرت دی بلکہ انسانیت کے روشن مستقبل میں ان کا یقین دوبارہ پختہ ہوتا گیا۔

فیض کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید ٹوٹ جاتا، کیونکہ ان کے حالات میں یکا یک جو تبدیلی آئی تھی وہ بے حد تکلیف دہ تھی۔ ہمیں یاراں دوزخ، ہمیں یاراں بہشت فیض کو اپنی بیوی اور بچیوں سے دور قید تنہائی میں ڈال دیا گیا تھا اور ایک کچے دھاگے میں باندھ کر سزائے موت کی تلوار ان کے سر پر لٹکا دی گئی تھی۔ وہ تو کہیے کہ ان کے ٹھنڈے، صوفیانہ اور مست مزاج، ایلس کی بے پناہ وفاداری اور سجاد ظہیر، سبطِ حسن اور میجر محمد اسحاق جیسے لوگوں کی دوستی نے انہیں ٹوٹنے نہیں دیا۔ جیل کے طویل وقفے کا فائدہ اٹھا کر انہوں نے اپنا دل شاعری میں لگایا اور جو کچھ انہیں کہنا تھا شاعری میں کہا اور پھیا تک تناؤ کے بیچ میں بھی اپنے سر کو اونچا رکھا۔

23 فروری کی میٹنگ میں سازش کرنے کا فیصلہ قطعی نہیں ہوا تھا۔ فیض کے وکیل نے پرزور

طریقے سے ٹرائی بیونل کے سامنے یہ بات رکھی تھی، لیکن فیض نے اپنے ایک پر اثر شعر میں اس جھوٹ کا جو پردہ فاش کیا وہ تمام دلیلوں کے مقابلے کہیں زیادہ پر اثر ہیں:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

'زنداں نامہ' کی ایک غزل میں انہوں نے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس وقت کے پاکستان میں انسان پر ظلم کرنے کے لیے اس بات کا انتظار نہیں کیا جاتا تھا کہ وہ کوئی جرم کرے۔ جرم کرنے سے پہلے ہی اُسے سزا سنا دی جاتی تھی، جیسا کہ راولپنڈی 'سازش' کے معاملے میں واقعی ان کے ساتھ ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسا تو دنیا میں کہیں بھی نہیں ہوتا، ہر جگہ پہلے جرم ہوتا ہے پھر اس کی سزا سنائی جاتی ہے:

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھیں تیری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے عتاب جرمِ سخن سے پہلے

ابھی تو یہ حالت ہے کہ سزا پانے والا یہ بھی پوچھ نہ سکے کہ اسے کس گناہ کی سزا دی جا رہی ہے۔ قاتل مقتول کو اپنی تیغ کا حسن بھی نہیں دیکھنے دیتا کہ وہ کس ادا سے گردن کو دھڑ سے علاحدہ کرتی ہے، بلکہ خود مقتول کو حکم سنا دیتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنی جان لے کر اس کے حوالے کر دے:

کرے کوئی تیغ کا نظارہ اب ان کو یہ بھی نہیں گوارہ
بضد ہے قاتل کہ جانِ بسمل فگار ہو جسم و تن سے پہلے

اپنے ایک اور شعر میں وہ یہ حقیقت بیان کرتے ہیں کہ پاکستان کے کسی بھی حکمران نے وہاں کی عوام کے مسائل کو حل کرنے میں کوئی دل چسپی لی ہی نہیں، دیکھا جائے تو یہ بات ایک ملک نہیں بلکہ پورے برِ اعظم صغیر کے بارے میں عائد ہوتی ہے، ورنہ عوام کے مسائل ایسے نہ تھے جن کا حل ممکن نہ ہو:

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دُکھ تھے بہت لادوا نہ تھے

یوں تو ان کے پہلے مجموعہ 'نقشِ فریادی' میں بھی کہیں کہیں تلخی ملتی ہے، تند وخو اور زم مزاجی، لیکن جیل کے دوران یہ تلخی بے حد پر اثر ہو گئی ہے۔ اب تو یہ درد کی لپٹی ہوئی تلخی ان کی شاعری کی ایک خاصیت بن گئی، ان کی ہر دلعزیزی کا اہم حصہ ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے کلاسیکل فارم 'واسوخت' پر بھی ہاتھ آزمایا، جس میں دل جلا عاشق روایتی خوشامد درامد چھوڑ کر معشوق کو جلی کٹی سنانے پر آمادہ ہو جاتا ہے، اور اس میں ایسے ایسے شعر کہے جن کا ثانی اردو شاعری میں آسانی سے نہیں ملتا۔ 'واسوخت' کا ایک ایسا شعر ملاحظہ ہو:

گر فکرِ زخم کی تو خطا وار ہیں کہ ہم
کیوں محوِ مدحِ خوبیِ تیغِ ادا نہ تھے

گویا عوام کے دکھوں اور اس پر ہونے والے ظلموں کی بات کرنا شاعر کے لیے گناہ ہے۔ ہاں جی! اس کا کام تو یہ ہے کہ وہ عوام پر حکمران کے ظالموں کی خوب تعریف کرے اور عوام کی تکلیفوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ بیشک، ہمیں تو آپ کی تلوار کی تعریف میں محو ہو جانا چاہئے تھا کہ وہ کس ادا سے وار کر کے ہماری گردن کو دھڑ سے الگ کر رہی ہے۔ اگر ہم نے ایسا کرنے کے بجائے اپنے جسم اور روح پر لگے زخموں کی پرواہ کی تو یہ ہمارا گناہ ہے جس کے لیے ہمیں مزید سزا ملنی ہی چاہئے۔

آنے والی مصیبتوں پر ہنسنے کا تو انہوں نے جیسے تہیہ ہی کر لیا تھا اور اسے اپنی فطرت کا حصہ بنا لیا تھا۔ ان کے مداحوں میں اس بات پر مکمل اتفاق ہے کہ اگر راولپنڈی کیس نہ ہوا ہوتا تو شاید فیض اتنے بڑے اور اپنی طرح کے اکیلے شاعر نہ ہو پاتے۔ جیل میں انہوں نے خوب لکھا اور خوب ستائش ہوئی۔ جیل میں انہیں لکھنے کی آزادی تھی اور پندرہ دن میں ایک بار وہ جیل کے اپنے ساتھیوں کو اپنا کلام سنا بھی سکتے تھے، سناتے بھی تھے۔ اس طرح ہر پکھواڑے میں ایک بار جیل میں چھوٹا موٹا مشاعرہ ہو جاتا تھا جس میں فیض اپنا تازہ ترین کلام اپنے ساتھیوں کو سناتے تھے۔ شاعری کی مٹھاس اور اُجالے میں جیل کی تلخی اور تاریکی ڈھل جاتی تھی اور ناامیدی کے بادل چھٹ جاتے تھے، صبح کی

سنہری دھوپ جیل کا اندھیرا چیر کر اپنی مدھر مُسکان بکھیرنے لگتی تھی۔ فیض کا کلام جیل سے باہر بھی جا سکتا تھا۔ مہینے میں ایک بار ایلس جیل میں ان سے ملنے آتیں اور مہینے بھر کے اندر جو کچھ انہوں نے لکھا ہوتا وہ ایلس کی نذر کر دیا جاتا تھا۔ وہ باقاعدہ سینسر سے ٹھپا لگوا کر اسے اپنے ساتھ لے جاتی تھیں۔ فیض کے مداحوں کو اس بات پر حیرانی ہوئی کہ جیل انتظامیہ نے فیض کو یہ سہولت کیوں اور کیسے فراہم کی تھی؟ کچھ نے قیاس لگایا ہے کہ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اوپر سے دیکھنے میں یہ شاعری رومانی لگتی ہے اور یہ رومانی لبادہ اتنا بھاری ہے کہ اس کے نیچے چھپی ہوئی انقلابی چیتنا (شعور) جیل کے افسران کی سمجھ میں شاید ہی آتی رہی ہو۔ ان میں ایک آدھ یہ اندازہ لگانے سے بھی باز نہیں آیا ہے کہ ہو سکتا ہے جیل کا کوئی جیلر عام طور پر شاعری کا یا خاص طور پر فیض کا مداح رہا ہو اور داد دینے کا اس کا طریقہ یہ رہا ہو کہ ان کی شاعری کو جیل سے باہر جانے دیا جائے، آخر ایک ایسی حکومت سے ان کی کیا ہمدردی ہو سکتی تھی جو بدعنوانی کے لیے تیزی سے بدنام ہو رہی ہو۔

بہرحال، 1951 میں فیض راولپنڈی 'سازش' کیس میں گرفتار ہوئے اور ایک ہی سال بعد، یعنی 1952 میں ان کا دوسرا شعری مجموعہ 'دستِ صبا' شائع ہو گیا۔ اس کے بازار میں آتے ہی ایک باغی شاعر کی حیثیت سے فیض کی دھوم مچ گئی۔ سجاد ظہیر نے جیل سے اعلان کیا، 'آگے چل کر لوگ راولپنڈی کونس پریسی کیس کو بھول جائیں گے لیکن پاک مورخ 1952 کی اہم وارداتوں میں شاعری کے اس چھوٹے سے مجموعے کا ذکر کرنا نہیں بھولے گا اور اسے ایک خاص اہم واردات کی صورت میں یاد کرے گا۔'

دستِ صبا اور اس کے بعد 1956 میں شائع تیسرے شعری مجموعے 'زنداں نامہ' میں فیض کے ہنر کا پورا انکھار نظر آتا ہے۔ فیض نے اردو شاعری میں سیکڑوں سالوں سے استعمال کیے جانے والے عکسوں، استعارات وکنایات کا کُھل کر استعمال کیا ہے اور انہیں نئے معنوں سے پُر کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر ناصح کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات غور طلب ہے کہ ان کے پہلے شعری مجموعے، نقشِ فریادی، کی غزلوں میں یہ حضرت ایک بار بھی تشریف نہیں لائے ہیں، اگرچہ ان کا شمار اردو کی کلاسیکی

محفل میں لازمی طور پر ہوتا ہے اور پہلے مجموعے کی بیشتر غزلیں کلاسیکی ہیں، طرز اور بیان دونوں کی ہی نظر سے۔ ناصح کا سیدھا سادھا مطلب ہے نصیحت دینے والا۔ وہ ایسا شبھ چنتک (بھلائی چاہنے والا) ہے جو بندے کو دنیاوی جاذبیت سے ہٹا کر خدا کی راہ پر لانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اس کی عاقبت سنور سکے۔ لیکن 'دستِ صبا' میں پہلی بار نمودار ہونے والا ناصح شراب اور دنیاداری چھوڑ کر خدا کی راہ پر چلنے کی نصیحت دینے والا شخص نہیں ہے، وہ ایک ایسا دنیادار شخص ہے جو آدمی کو مصلحت کے فائدے اور راستے بتا کر اور نیک طرز کے راستے کے مصائب گنا کر، اسے انقلاب کے راستے سے بھٹکانا چاہتا ہے اور شاید اسی لیے شاعر کے طنز و مزاح کا نشانہ بن جاتا ہے۔ فیض کے لیے انقلاب ان کا یار ہے، معشوق ہے، جس کی دہلیز سے وہ کبھی ہٹ نہیں سکتے، بلا سے ناصح کچھ بھی کہتا رہے:

ہوئی ہے حضرت ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور شبِ کوئے یار گزری ہے

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو پندگرو راہِ گزر تو دیکھو

جگہ جگہ پہ تھے ناصح تو کو بہ کو دلبر
انہیں پسند انہیں ناپسند کیا کرتے

ہے خبر گرم کہ پھرتا ہے گریزاں ناصح
گفتگو آج سرِ کوئے بتاں ٹھہری ہے

انقلاب کے لیے انہوں نے 'محبوب'، 'جنوں'، 'یار'، 'عشق' وغیرہ کا استعمال کیا ہے:

وہ تو ہے تمہیں ہو جائے گی اُلفت مجھ سے
ایک نظر تم میرا محبوب نظر تو دیکھو

قفس اُداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

گر بازیٔ عشق کی بازی ہے جو کچھ بھی لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا ہارے بھی تو بازی مات نہیں

ان کا یہ شعر دیکھئے جس کا مطلب ان کے سمبلس (symbols) کی جادوگری اور انقلابی نظریہ کو سمجھے بغیر ظاہر ہی نہیں ہوتا، یا پھر وہ ایک معمولی سا شعر ہو کر رہ جاتا ہے:

اب کوچۂ دلبر کا رہرو رہزن بھی بنے تو بات بنے
پہلے سے عدو ٹلتے ہی نہیں اور رات برابر جاتی ہے

اس شعر میں فیض پاکستان کی سیاسی سماجی حقیقت بیان کرتے ہوئے اشارہ کرتے ہیں کہ اگر ہمارے محبوب ملک کے حالات بدلنے ہیں تو شاید پرامن طریقوں سے ایسا کرنا ممکن نہ ہو۔ دلبر کے کوچے کا مسافر تو وہاں پہنچ کر اپنے معشوق کا دیدار کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کے دروازے پر دشمن پہرہ دے رہے ہیں جو اسے گھسنے نہیں دیں گے اور اگر وہ واقعی وہاں پہنچنا ہی چاہتا ہے تو شاید اسے رہزن بن کر وہاں زبردستی داخل ہونا پڑے گا۔ 'رات برابر جاتی ہے' سے شاعر شاید یہ کہنا چاہتا ہے کہ ملک میں انقلابی حالات تو بنتے ہیں لیکن اگر ان کا فائدہ اٹھا کر انقلابی کارروائی نہ کی جائے تو وہ گزر جاتے ہیں اور دریار پر دشمنوں کا قبضہ برقرار رہتا ہے۔ اسی غزل کے ایک اور شعر میں فیض پاکستان کے حالات پر ایک اور وضاحت کرتے ہیں:

بیداد گروں کی بستی ہے یاں داد کہاں خیرات کہاں
سر پھوڑتی پھرتی ہے ناداں فریاد جو در در جاتی ہے

ظالموں کی اس بستی میں مانگنے سے کیا ملنے والا ہے؟ظلم کرنے والے خیرات دینا کیا جانیں؟ ظالموں سے فریاد کرنے والے تو نادان ہیں، پہلے دردر جا کر اپنا دامن پھیلاتے ہیں اور جب کسی در سے کچھ نہیں ملتا تو اپنا سر پھوڑتے ہیں۔ اس شعر کو پہلے والے شعر سے ملا کر پڑھیں تو یہ بات پختہ ہوجاتی ہے کہ جیل میں منتھن (دماغ پچی) کرتے کرتے فیض اس بات پر مطمئن ہو چلے تھے کہ ان کے ملک میں پرامن طریقوں سے کچھ کر پانے کا امکان کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے اور یہاں کچھ ہوسکتا ہے تو شاید جارحانہ طریقوں سے ہی ہوسکتا ہے۔

لیکن جارحانہ طریقوں سے کام کرنے کے اپنے خطرے ہیں۔ ایسا کرنے والوں کی جان جا سکتی ہے۔ تب تک تو یہ بھی طے نہیں ہوا تھا کہ عدالت فیض کو سزائے موت تو نہیں دیدے گی؟ اسی غزل کا ایک اور شعر دیکھیں تو جیل میں فیض کے فکر کی پوری نمائندگی ہوجاتی ہے:

ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجئے
ہر رہ جو ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کر جاتی ہے

جان کسے پیاری نہیں ہے۔ کوئی بھی جاندار بے مقصد جان دینا نہیں چاہتا۔ وہ تو مقتل یا قتل گاہ سے دور ہی رہنا چاہتا ہے کیونکہ وہاں تو اسے موت اور خونریزی کے منظر دیکھنے کو ملیں گے۔ لیکن، اس مجبوری کا کیا کیا جائے کہ ہماری منزل کو جانے والی ہر راہ مقتل سے گزر کر ہی جاتی ہے، ایسی کوئی راہ دکھائی ہی نہیں دیتی جس پر چل کر خون سے بچا جا سکے۔ انقلاب کے طلبگاروں کو بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار رہنا پڑتا ہے، سر ہتھیلی پر لے کر میدان میں اترنا پڑتا ہے، وہ اپنی جان کی فکر نہیں کرسکتے، کریں گے تو کچھ کر ہی نہیں پائیں گے۔ حکام نے ایسے حالات پیدا کردیئے ہیں کہ ہنسا (تشدد) کے بغیر یہاں کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ ماردینے یا مرجانے کے علاوہ انہوں نے کوئی راستہ چھوڑا ہی نہیں ہے۔

اردو ادب کے چوکنے پرستار غور کررہے تھے کہ جیل میں فیض ایک نئی شاعری کی داغ بیل ڈال رہے ہیں جس میں غزل کی کلاسیکی صورت قائم رکھتے ہوئے نئی سے نئی، ترقی پسندی سے لبریز اور

انقلابی سے انقلابی بات کہی جاسکتی ہے۔ مارکسوادی تنقید اس بات پر بھی غور کررہی تھی کہ اس سے اینگلس کا وہ اصرار بھی پورا ہوتا ہے جو ادیب کو ہدایت دیتا ہے کہ آپ اپنی آئیڈیولوجی کو آرٹ کے پردے میں جتنی باریکی سے چھپا کر پیش کریں گے آپ کی شاعری اتنی ہی زیادہ کارگر اور کامیاب ہو سکے گی۔ غزل کی صنف کے چاہنے والے اس لائحہ عمل سے خوش تھے کیونکہ ان غزلوں سے ان غزل مخالفین کو دندان شکن جواب مل رہا تھا، جو یہ کہتے نہ تھکتے تھے کہ غزل کا زمانہ لد چکا ہے اور اس میں اچھی شاعری کے جتنے امکانات تھے، سب اپنی افادیت کھو چکے ہیں، لہٰذا اب جو لوگ اپنی فکر کا دائرہ وسیع کرنا چاہتے ہیں اور اپنے گفتگو میں دکھوں سے بھری دنیا کے مرحلوں سے مخاطب ہونا چاہتے ہیں یا نئے زمانے کے واسطے سے شعر میں کوئی نئی بات پیدا کرنا چاہتے ہیں انہیں غزل میں طبع آزمائی نہیں کرنی چاہیے۔

راولپنڈی کی یہ فوجی بغاوت یا سازش ناکام رہی، لیکن کچھ ہی عرصہ بعد وہاں فوج نے حکومت کا تختہ پلٹ دیا اور جب ایک بار اس کے مُنہ کامیابی کا خون لگ گیا تو اس نے ایسا بار بار کیا۔ مستقل جمہوریت پاکستان میں کبھی آنے ہی نہیں دی گئی، آئی بھی تو اسے رہنے نہیں دیا گیا۔ عوام کے جمہوری حقوق ہمیشہ پیروں تلے روندے گئے اور اس کا سب سے بڑا اثر ان دانشوروں اور ادیبوں پر پڑا جو اظہار کی آزادی کے بنا اسی طرح تڑپتے ہیں، جیسے پانی کے بنا مچھلی۔ ایسے خونخوار وقفوں میں فیض کی جیل میں کی گئی ایجاد بڑے کام آئی اور انہیں بڑے سے بڑا خطرہ اٹھا کر بھی اظہار خیال کے نئے نئے طریقے نکالے، جنہوں نے اردو شاعری کو مالا مال کردیا۔

فیض کی راہ پر چل کر یا ان کی شاعری سے پریرنا (حوصلہ) پا کر پاکستان کے اردو شاعر، احمد فراز، ابن انشاء، سیف، فارغ بخاری، افتخار عارف، زہرا نگاہ اور سرحد کے ادھر اُدھر دونوں ملکوں کے سیکڑوں نوجوان شاعر نئی قسم کی غزل کہہ رہے تھے جس کی روح عوامیت اور انقلابی تھی لیکن غزل کا کلاسیکی ڈھانچہ برقرار تھا۔ اب برّ اعظم میں ایک نئی قسم کی غزل کا آغاز ہو رہا تھا اور جیل میں بیٹھے اس کے موجد فیض اس کارنامے سے خود بھی باخبر تھے:

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد

فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

جیل میں فیض نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی کہیں جن میں سے کئی تو ایسی ہیں جو اردو ادب کی تاریخ میں امر رہیں گی۔ یہاں ان پر غور نہیں کیا جاسکتا، لیکن ایک مثال لے کر یہ سمجھنے کی کوشش ضرور کی جاسکتی ہے کہ ایک بڑا شاعر جیل کی دل شکن زندگی کو کس طرح شعر میں ڈھال کر خوبصورت بنا سکتا ہے۔

بات تب کی ہے جب فیض قیدِ تنہائی کاٹ رہے تھے۔ انہیں ایک تنگ اندھیری کوٹھری میں بند کر دیا گیا تھا اور وہاں اکیلے رہتے ہوئے انہیں وقت کا اندازہ بھی نہ ہو پاتا تھا۔ کوٹھری میں ایک سوراخ سا تھا جس سے چھن کر سورج کی کوئی بھٹکی ہوئی کرن انہیں اطلاع دے جاتی تھی کہ ابھی دن باقی ہے۔ جب اس سوراخ سے روشنی آنا بند ہو جاتی تھی تو قیدی سمجھ لیتا تھا کہ اب میرے وطن میں رات ہو گئی ہوگی۔ صبح ہوتے ہی اس سوراخ سے سورج کی ایک ننھی سی کرن ان کی کوٹھری کو روشن کر دیتی تھی اور اس ابھرتی دھوپ میں ان کے ہاتھوں میں لگی لوہے کی ہتھکڑی چاندی کی طرح دمک اٹھتی تھی۔ یہ قیدی کے لیے صبح ہونے کی اطلاع تھی۔ اب دیکھا جائے کہ فیض قیدِ تنہائی کی اس کیفیت کو اپنی بیحد مشہور اور مقبول نظم 'نثار میں تیری گلیوں پہ اے وطن' میں کس طرح باندھتے ہیں:

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے

کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی

چمک اٹھے جو سلاسل تو ہم نے جانا ہے

کہ اب سحر تیرے رخ پر بکھر گئی ہوگی

غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں

گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

گویا صبح سے شام تک شاعر کو ایک ہی کام ہے، مادرِ وطن کے بارے میں سوچنا اور جیل کی تنگ ہوتی جا رہی دیواروں کے بیچ وطن اور ہم وطنوں سے اپنا رشتہ بنائے رکھنا، اسے اور پختہ کرتے رہنا اور

جینا۔ حالات کتنے ہی ناگوار کیوں نہ ہوں، شاعر کا یہ فیصلہ اور حوصلہ قابلِ غور ہے کہ اسے جینا ہے، جیل کی تنگ دیواروں میں قید ہو کر بھی اسے کل کے لیے جینا ہے، ایک شاندار کل کے لیے جس سے وہ اور اس کی شاعری مشروط ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ جیل میں لکھے گئے اس کلام کی بدولت فیض کی شان ایک باغی، انقلابی، وطن پرست اور ایسے انسان دوست شاعر کی بنی، جو غزل اور نظم کے کلاسیکل پیمانوں پر بھی پورا اترتا ہے۔ آخری دم تک فیض کی یہی چھوی (image) بنی رہی، یہ تو وہ سب جانتے ہیں لیکن اس کے پیچھے ان کا کتنا سنگھرش، پختہ ارادہ اور زیادہ خود اعتماد چھپا ہے، اس پر دھیان جاتا تو ہے لیکن ہمیشہ تک نہیں پاتا۔

راولپنڈی کانس پریسی کیس فیض کو تو نہیں توڑ پایا لیکن اس نے پاکستان کی کیمونسٹ پارٹی کی ریڑھ ضرور توڑ دی۔ 1954 میں اس کیس کا فیصلہ آتے ہی پاکستانی حکومت نے نہ صرف کیمونسٹ پارٹی کو، بلکہ اس کے تمام عوامی تنظیموں کو بھی غیر قانونی ہونے کا اعلان کر دیا۔ ٹریڈ یونین فیڈریشن، اسٹوڈنٹس فیڈریشن، میڈیکل ایسوسی ایشن، پاکستان پیپلس تھیٹر ایسوسی ایشن، پاکستان کی انجمن ترقی پسند مصنفین جیسے تمام عوامی تنظیموں کو غیر قانونی قرار کر دیا گیا اور وام پنتھی (بائیں بازو) کی کاروائیاں ایک جھٹکے کے ساتھ روک دی گئیں۔ سب سے مُہلک حملہ پاکستانی پیپلس ہاؤس پر کیا گیا جس کی قیادت قائداعظم کے چہیتے اور ملک کے وام پنتھی لیڈر میاں افتخار الدین نے کی تھی اور جو پاکستان ٹائمز، امروز، لیل و نہار جیسے اخبارات و رسائل اور وام پنتھی ادب کا بڑا مطبع ہونے کے ناطے پچاسوں کیمونسٹوں کو روزی روٹی مہیا کراتا تھا۔ پیچھے ہٹ کر مظاہرے کے نئے طریقے اور نئی صورتیں نکالنے میں بہت وقت لگ گیا اور بعد میں جب یہ کارروائیاں شروع ہوئیں بھی تو ان میں پہلے جیسا دم خم نہیں پیدا کیا جاسکا اور پھر ملک میں لگاتار فوجی بغاوتیں بھی ہوتی رہیں، جن کا پہلا شکار بائیں بازو کی طاقتوں کو ہی بنایا جاتا تھا۔

ایلس فیض پر لوٹے بغیر اس ذکر کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اس حادثہ نے انہیں نہ جانے کتنی طاقت اور خود اعتمادی سے بھر دیا تھا۔ ان کی معاشی حالت اچھی نہ تھی اور بے پناہ خرچ ہاتھ پھیلائے سامنے کھڑا تھا۔ انہوں نے کمر کس کر پاکستان ٹائمز میں نوکری کی اور دو ننھی بچیوں کے ماں باپ دونوں

کی ذمہ داری اکیلے سنبھالی۔ اپنی بچیوں کو مہنگے اور اونچے اسکول سے ہٹا کر انہوں نے معمولی اسکول میں داخل کرا دیا۔ کار کھڑی کر دی اور رکشہ میں آنا جانا شروع کر دیا۔ انہوں نے اپنی بچیوں کو ملک کے تمام بچوں سے وابستہ کر دیا اور اخبار میں اپنے کالم کے ذریعے نہ صرف ان کا مزہ لیا بلکہ ایک پیاری ماں یا بڑی بہن کی حیثیت سے انہیں سائنٹیفک اور سیکولر تعلیم دے کر ان کا ذہنی دائرہ بھی وسیع کیا۔ مہینے میں ایک بار وہ لاہور سے تیسرے درجے کا ٹکٹ لے کر لمبا اور تکلیف دہ فاصلہ طے کر کے سندھ کے بدلتے موسم کے مزاج سے گزر کر حیدر آباد کی جیل میں اپنے شوہر اور شریک حیات سے ملنے پہنچتی تھیں اور باہری دنیا سے انھیں روبرو کراتی تھیں۔ جیل سے وہ فیض کا کلام لے کر آتی تھیں اور پھر ان کے دوستوں کی مدد سے اسے شائع کرانے کے کام میں جٹ جاتی تھیں۔ یہ سچ ہے کہ فیض کے دوستوں نے ان کا ساتھ نبھایا، تو بھی گھر چلانے کی پوری ذمہ داری ایلس کے کندھوں پر آ پڑی تھی اور پھر اکیلے پن میں اپنا یقین جگائے رکھنا اور اپنے صنم کی سزائے موت کے خطرے کے نیچے ہنستے ہنستے جینا اور جیل میں بند قیدی کا حوصلہ بنائے رکھنا آسان کام نہ تھا، لیکن ایلس فیض نے اسے اس خوبی سے انجام دیا کہ ان کی تعریف میں الفاظ چھوٹے پڑ جاتے ہیں۔ فیض اپنی اس دلیر شریک حیات ایلس کو صرف بیوی نہیں مانتے، انہیں اپنے دوست کا درجہ دیتے ہیں۔ دوست کی پہچان یہی بتائی گئی ہے کہ وہ وقت ضرورت پر کام آتا ہے، مصیبت میں ساتھ نبھاتا ہے اور ناامیدی کے لمحوں میں حوصلہ باندھتا ہے۔ ایلس ان سارے پیمانوں پر پوری اُتریں اور اس میں شک نہیں کہ اُن کی وجہ سے جیل میں فیض کی زندگی کو ایک عجیب طرح کا سکون ملتا رہا اور ان کے ارادوں کے عزم کو مضبوطی ملتی رہی۔ ان کے جیل کے ساتھی بھی ان کا بے حد خیال رکھتے تھے مگر پھر بھی جب ان کے دل میں ٹیسیں اٹھتی تھیں تو اس کیفیت کا اظہار بھی کر بیٹھتے تھے:

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں ہر روز نسیم صبح وطن
یادوں سے معطر آتی ہے اشکوں سے منور جاتی ہے

کوئے یار سے سوئے دار تک

ڈاکٹر ایم اے جاوید

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

فیض ہمارے دور کے ان شعرا میں تھے جو اپنی زندگی میں ہی ایک دیومالائی کردار بن گئے تھے۔ ان کی شخصیت کے انیک پہلو تھے۔ صحافت اور تعلیم سے ان کی گہری وابستگی رہی۔ ڈاک تار اور ریلوے مزدوروں کی انجمن کی سربراہی بھی کی۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک، عالمی امن تحریک، افرو ایشائی ادیبوں کی تحریک میں انہوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ دبے کچلے انسانوں سے انہوں نے شدت سے پیار کیا۔ دنیا کے محنت کش انسانوں کی زندگی اور بہتر مستقبل کے لیے ان کی جدوجہد کے ساتھ ان کا گہرا رشتہ رہا۔ ڈاکٹر قمر رئیس کے لفظوں میں برصغیر کے عوام ظلم و تشدد اور استحصال کے شکنجے سے آزادی کے لیے جو جدوجہد کر رہے تھے، جو قربانیاں دے رہے تھے اس کا رزمیہ آہنگ فیض کی شاعری کے رجائی اور غنائی لہجہ میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ خود موجِ خوں سے گذر رہے ہوں۔ ظلم و جبر کے خلاف احتجاجی نظمیں لکھنا یا دنیا کے غم کو اپنانے کا دعویٰ کرنا ایک بات ہے لیکن انسانوں کے دکھ درد کو اپنی روح کی گہرائیوں میں اپنے احساس و شعور میں رچا لینا دوسری بات ہے۔ دنیا کے انسانوں سے یہ احساس یگانگت فیض کی شخصیت اور شاعری کا امتیازی وصف ہے۔ فکر

کی اس پرواز ہی نے فیض کو عوام و دانشوروں کا مقبول شاعر بنا دیا۔ اس کا احساس ہمیں حال ہی میں فیض کی صد سالہ سالگرہ کی تقریبات دیکھ کر شدت سے ہوا۔

فیض نے اپنے دور کی اتنی جمیل ترجمانی کی ہے کہ ان کی ذات اُن کی زندگی میں ایک تحریک کا درجہ اختیار کر چکی تھی۔ فیض اردو شاعروں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں نمودار ہوئی۔ 1935 سے 1945 تک کا زمانہ اردو شاعری اور ادب میں ہنگامے کا دور رہا۔ یہ باغیانہ ادب کا دور تھا۔ ہر طرح کے استحصال، سماج پر چھائی ہوئی دقیانوسیت اور اقدار کے کھوکھلے پن سے نئی نسل کے شاعر و ادیب بیزار تھے۔ 1936 میں انجمن ترقی پسند مصنفین وجود میں آ چکی تھی۔ نظیر صدیقی کے تجزیے کے مطابق اس تحریک کے اثر سے شعر و ادب میں تنقید حیات کو تفسیر حیات پر، مسئلہ زندگی کو فلسفۂ زندگی پر، ارضیت کو ماورائیت پر، مقدس سنجیدگی کو شیریں دیوانگی پر، حقیقت پسندی کو تخیل پرستی پر، اجتماعیت کو انفرادیت پر، عوام کو خواص پر، انقلاب اصلاح پر، پردہ داری کو رفو گری پر، نشتر کو مرہم پر، حوصلۂ تعمیر کو حسرتِ تعمیر پر، رجائیت کو قنوطیت پر، خیال کو اسلوب پر، تجربے کو روایت پر، نظم کو غزل پر، سیاسی شاعری کو رومانی شاعری پر ترجیح دی جانے لگی۔ نئی اور پرانی قدروں کی باہمی آویزش کے اس بحرانی دور میں جن فنکاروں نے سلامت روی اور اعتدال پسندی کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا ان میں فیض کا نام نمایاں ہے۔

فیض کی شاعری رومان پرستی اور حقیقت پسندی کا ایک خوبصورت مرقع ہے۔ اپنی نظم موضوع سخن میں وہ کہتے ہیں:

لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کم بخت دل آویز خطوط
آپ کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے
اپنا موضوعِ سخن اس کے سوا کچھ بھی نہیں
طبعِ شاعر کا وطن اس کے سوا کچھ بھی نہیں

فیض کی شاعری میں رومان پسندی اور حقیقت پسندی کا امتزاج ہے۔ فیض نے اپنی شاعری کا آغاز روایات کی تقلید میں رومانی اشعار سے کیا تھا:

تیرا ہی عکس ہے ان اجنبی بہاروں میں
جو تیرے لب ترا بازو ترا کنار نہیں
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
ہم کو احسان کا پاس ہوتا ہے

لیکن فیض کا ذہن صرف اس نکتے پر سمٹ کر محدود نہیں رہ گیا۔ بلکہ اس منزل پر پہنچ کر زمانے کے اور بھی غموں کا عرفان ان کی شاعری کو ایک خاص راستے پر ڈال دیتا ہے۔ ان کے ذہنی سفر کی عکاسی ان کا یہ شعر کرتا ہے:

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

کوئے یار اور سوئے دار ان کی شاعری کے دو محور ہیں۔ شعلہ و شبنم کا یہ حسین امتزاج ان کی شاعری کی عظمت ہے۔ ان کے یہ دونوں محرکات ان کی نظم 'دو عشق' میں واضح طور نظر آتے ہیں:

اس عشق نہ اس عشق پہ نادم ہے مرا دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغ ندامت

فیض کی شاعری میں روایت اور ندرت خیال کا یہ سنگم ان کی نظم 'رقیب' میں موجزن ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کے رقیب کو ایک نئے زاویہ سے سمجھنے کی کوشش کی ہے:

میں نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جُز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

'غم محبت' انہیں غم حیات سے روشناس کرا رہا ہے:

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی

یاس و حرماں کے دکھ درد کے معنی سیکھے

زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا

سرد آہوں کے رخِ زرد کے معنی سیکھے

فیض کی شاعری ذوشعوریت کی حامل ہے اور انہیں یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے:

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

مجھ سے پہلی سے محبت مری محبوب نہ مانگ

یہاں سے فیض کی شاعری حقیقت نگاری کا موڑ اختیار کرتی ہے۔'لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے'۔ فیض کے دل وحشی کی طلبگاری جاری رہتی ہے۔ ان کا انفرادی عشق ان کے اجتماعی **انقلاب** کے شانہ بشانہ چلتا رہا۔ ان کا ذاتی عشق اور کائناتی عشق ایک دوسرے کے ہم آہنگ رہے۔ **فیض** کی شاعری کی یہ ہم آہنگی بتاتی ہے کہ ان کا ذہن مرکب اور پیچیدہ ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کی روایات کو بھی جذب کیا ہے اور ان میں توسیع کے تجربات بھی کیے ہیں۔ ان کے یہاں نفاست ہے۔ ان کے خیالات جتنے باغیانہ ہیں احساسات اتنے ہی عاشقانہ ہیں۔

فیض کی شاعری حقیقت نگاری اشتراکی تحریک کی پروردہ ہے۔ یہ محنت کش طبقے کی جانبدار اور اشتراکی نقطۂ نظر کی حامل ہے۔ فیض نے انسان دوستی کے درد کو اپنایا۔ مگر فیض نے اشتراکیت کو اپنا کر بھی اپنے سے رشتے مضبوط رکھے اور اپنی شاعری کو کسی 'اعلیٰ' اشارے کا غلام نہیں بنایا۔ ملکی یا غیر ملکی استبداد سے ڈر کر فیض نے کبھی مصلحت پسندانہ رویہ اختیار نہیں کیا۔ وہ جیل بھی گئے جو بقول ان کے باقی دنیا سے الگ تھلگ ایک دنیا ہوتی ہے۔ دکھ درد، مصیبتیں، سختیاں سب عذاب انہوں نے ایک شاعرانہ سرشاری کے ساتھ برداشت کیے:

ظلم کا زہر گھولنے والے

کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل

جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں

وہ بُجھا بھی چکے اگر تو کیا

فیض نے ہر حادثے کو ایک صحیح مقام بخشا ہے۔ بھوک سے بلبلاتے بچوں، بیمار جوانیوں، سسکتی نازنینوں، خاک میں لتھڑے ہوئے، خون میں نہلائے ہوئے جسموں پر ہی ان کی نظر لوٹتی ہے۔ وہ زندگی کے منفی حالات میں بھی مثبت عمل اختیار کرتے ہیں:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے

کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے

لبوں پہ مُہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے

ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

آخر میں، میں یہ کہنا چاہوں گا کہ فیض کی شاعری جس داد و تحسین کی مستحق ہے اس کا ایک حرف بھی مجھ سے ادا نہیں ہو پایا اور ادا ہو بھی کیوں کر ہو، یہ معاملہ لفظوں کا ہے ہی نہیں۔ ممتاز حسین کے مطابق وہ جس نے خونِ دل میں انگلیاں ڈبولی ہوں اور ہر حلقۂ زنجیر میں زبان رکھ دی ہو، جس کے قاتل دکھوں کے تیشوں سے تاریکی شب میں نور کوندا ہو، جس کے دیدۂ تر کی شبنم آمدِ صبح کا پیغام لائی ہو، جس کی آبلہ پائی نے درد کے فاصلے مختصر کر دیے ہوں، اس کی شاعری کا خراج الفاظ نہیں عقیدت ہے:

پوچھتے ہیں وہ جاں نثاروں کو

تم بھی حسرت اٹھو سلام کرو

آج بھی ضروری ہے ہم فیض کی تقریر کے ان اختتامی الفاظ کو نہ بھولیں جو انہوں نے بین الاقوامی لینن امن کانفرنس میں کہے تھے:

''مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی ہار نہیں کھائی اب بھی فتح یاب ہو کر رہے گی اور آخر کار جنگ و نفرت اور ظلم و کدورت کے بجائے ہماری باہمی زندگی کی بنیاد

وہی ٹھہرے گی جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی کے مشہور شاعر حافظ نے کی تھی:

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است"

(ہر بات جس پر نظر ڈالیں اس میں خلل نظر آتا ہے۔ لیکن محبت کی وجوہات میں خلل نہیں ہوتا۔)

غرورِ عشق کا بانکپن

منموہن

فیض احمد فیض اور ان کی شاعری کی جگہ اور اس کی قیمت ٹھیک ٹھیک وہی بتا سکتے ہیں جو اردو زبان اور ادب کے اچھے جانکار اور دانشور ہیں۔ میری رسائی تو صرف اتنی ہے کہ اپنے کچھ 'امپریشن' (یا اس شاعر کے ساتھ اپنے لگاؤ کی کچھ تفصیلات) رکھ دوں، سو یہاں میں انہیں کو رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

7ویں دہائی کے جمہوری ابھار کے برسوں میں خاص طور پر، اور اس کے بعد لگا تار، ہماری نسل کی ہندی تخلیق کو ہمارے جن بزرگ استادوں کا خاموش لیکن مضبوط ساتھ اور سہارا ملا، ان میں جرمنی کے برتولت بریخت، ترکی کے ناظم حکمت اور ہماری اردو زبان کے فیض احمد فیض شاید سب سے اہم تھے۔ شاید اس پورے دور میں نئی تخلیقات کو بریخت کی سخت تنقید اور ان کو تضادوں کے بیچ میں دیکھنا سکھایا ہے اور فیض یا ناظم حکمت کی کھری انقلابی اور رومانیت نے موجودہ میدان جنگ میں اپنے موقف کے ساتھ کھڑے رہنے کا حوصلہ دیا ہے اور شکست اور الگاؤ کے مشکل لمحات میں اپنی خودداری کی حفاظت کرنا سکھایا ہے۔

یہ بات بھی غور کرنے لائق ہے کہ پرانے ترقی پسند آندولن کی بیحد مالا مال وراثت میں بھی کیوں فیض کی موجودگی ہمیں سب سے زیادہ وزنی اور جاندار لگتی رہی ہے۔ وہ آج بھی لگ بھگ ہر طرح سے ہمارے ہم عصر ہیں۔ بلکہ میں سوچتا ہوں، 1990 کے بعد نو سامراجی بربرتا کے نئے عالم

میں فیض کی شاعری میں ہمارے دلوں کی دھڑکن اور زیادہ صاف سنائی دینے لگی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ایمرجنسی کے خوفناک دنوں میں جب سوئیساچی کی ادارت میں شائع ہونے والے 'اُتراردھ' کا پہلا شمارہ (ویسے شمارہ 11) چھپا اور میگزین کی پشت پر فیض کی نظم 'لہو کا سراغ' ('کہیں نہیں ہے، کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ') چھپی تو کتنا برا بھلا سننا پڑا۔ ایک آدھ انقلابی دوستوں نے یہاں تک کہا کہ فیض 'بھٹو کے سفیر' کے سوا کیا ہیں؟ ان کی شاعری آپ نے کیوں چھاپی اور 'دستِ ناخونِ قاتل' یا 'خوں بہا' جیسے لفظوں کو کتنے لوگ سمجھے ہیں؟ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ نظم اور اس کے علاوہ ان دنوں اسی میگزین میں چھپیں 'بول کہ کب آزاد ہیں تیرے' اور 'نثار میں تیری گلیوں پہ' نظمیں نہ صرف سمجھی گئیں، بلکہ انہوں نے اس مشکل وقت میں عجیب سی طاقت دی اور ہمارے دلوں کو جھنجھوڑ کر آواز دی۔

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے فیض صاحب کو سننے کا اور ان سے چھوٹی سی ملاقات کا موقع ملا۔ شاید یہ 79-1978 کے درمیان کی بات ہے۔ ایک دن سنائی دیا کہ فیض ہندوستان ہی میں ہیں اور کچھ دنوں کے لیے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں لیکچر دیتے رہیں گے۔ ہم لوگ بڑے خوش تھے۔ پھر ایک دن ان کا کاویہ پاٹھ ہوا۔ شاید اس وقت کے 'ڈاؤن کیمپس' کی کلب بلڈنگ کے پاس کی کھلی جگہ میں کچھ قناتیں کھڑی کی گئی تھیں اور منچ بھی بنایا گیا تھا۔ اس دھوپ والے دن کا کھلا نیلا آسمان ابھی بھی یاد ہے۔ فیض صاحب نے جم کر اپنی بہت سی نظمیں و غزلیں کہی تھیں۔ جب وہ کھڑے ہوئے اور انہیں پہلی بار دیکھا تو تھوڑا عجیب سا لگا۔ صرف انہیں دیکھ کر ہر بار اس چھوی (شکل) کو کچھ دھکا سا لگتا تھا جو ان کا پڑھتے سنتے ہوئے من ہی من بن گئی تھی۔ سفاری سوٹ پہنے 'ٹپیکل' افسر یا منیجر لگتے تھے۔ لیکن جب فیض صاحب نے سنانا شروع کیا تو ان کی آواز نے دل کو چھو لیا، بلکہ سیدھے پکڑ لیا۔

حالانکہ ہم نے مشاعرہ کی روایتی دُھن میں ترنم کے ساتھ 'ہلکی شیریں آواز' میں ادا کیا ہوا مجروح سلطان پوری کا متاثر کرنے والا کلام سنا ہے: سیریلس کی طرز میں کیفی اعظمی یا سردار جعفری، کا

نظمیں پڑھنا دیکھا ہے، بابا ناگارجن کی باندھ دینے والے ڈرامائی روپ بھی دیکھے ہیں، آلوک دھنوا کا نہ بھلا دینے والا کلام بھی سنا ہے، اور تو اور جے این یو کے 'اسپینش سنٹر' کی مہربانی سے 'ریکارڈیڈ' آواز میں نیرودا کے اسپینش کلام کی ایک بانگی دیکھنے اور اتار چڑھاؤ کے ساتھ ان کی لے سے بھری ہوئی موثر بول کی کپکپاہٹ سے پر آواز سننے کا موقع ملا ہے۔ لیکن فیض کا انداز ان سب سے الگ تھا۔ یہ کسی بھی طرح کی 'پرفارمینس' سے کوسوں دور تھا۔ پھر بھی ان کی آواز میں ایک جادوئی کشش تھی، جس میں اپنے گہرے درد کے احساس کے ساتھ ایک ٹھہری عجیب و غریب ملائمیت اور اپنے پن کا میل تھا۔ یہ ایک دُکھ اٹھائے ہوئے، تجربہ کار، عمر رسیدہ شخص کی دلاسہ اور بھروسہ دلاتی ہوئی آواز تھی۔ ایسی آواز شاید اب کچھ پرانی بوڑھی، گھریلو عورتوں کے پاس ہی بچی ملے گی۔ فیض اتنے غیر بناوٹی اور سادے طریقے سے نظمیں کہتے تھے کہ کوئی بھی شاعری کا عاشق اسے خراب طریقے کی نظم پڑھنے کا انداز بھی کہہ سکتا تھا، لیکن یہ شاید زیادہ اچھا طریقہ تھا۔ ان کے علاوہ یہ چیز رگھوویر سہائے کے پڑھنے کے انداز میں بھی ملتی تھی، بلکہ وہ تو اس کا استعمال جان بوجھ کر بھی کرتے تھے۔ شمشیر* کا کہنے کا انداز بھی گفتگو ہی کا انداز تھا، جو ان کی نظموں کے مزاج میں ڈھلا ہوا تھا اور غزل تو اپنی اصطلاح میں ہی دل سے دل کی گفتگو ہے۔

خیر، فیض صاحب نے جم کر سنایا۔ وہ نظم بھی 'کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا'۔ فرمائشیں بھی خوب ہوئیں۔ کسی نے کہا فیض صاحب، 'گلوں میں رنگ بھرے' بھی سنائیے، تو فیض صاحب نے ہنس کر کہا 'کون سی سناؤں، نور جہاں والی سناؤں کہ مہدی حسن والی سناؤں' اور سب ہنس پڑے۔

اس بات کی کم اہمیت نہیں ہے کہ فیض کی شاعری کو نور جہاں، بیگم اختر، امانت علی خاں، ملکہ پکھراج، اقبال بانو، علی بخش ظہور، فریدہ خانم، فردوسی بیگم، برکت علی خان، شانتی ہیرانند اور مہدی حسن جیسی بے نظیر آوازیں نصیب ہوئیں۔ غالب کی شاعری کے بعد اتنی تعداد میں اوّل درجے کے گائکوں نے کسی اور شاعر کی چیزیں شاید ہی گائی ہوں۔ یقیناً اس سے فیض کی شاعری کا دائرہ وسیع ہوا

---

* شمشیر بہادر سنگھ ہندی کے مشہور ترقی پسند شاعر اور اردو نواز

ہے۔ان کی شاعری کے گہرے معنی اور مختلف معنی نکالے گئے ہیں۔ فیض کو پڑھ کر ہم نے جتنا جانا ہے ہندوستان اور پاکستان کے عظیم گلوکاروں سے سن کر کم نہیں جانا! گائک (گلوکار) بھی آخر کار اپنے گانے سے 'ٹیکسٹ' کی اپنی وضاحت پیش کرتا ہے اور ایک طرح سے تحریر کو دوبارہ لکھتا ہے لیکن شاید اس کی گنجائش 'ٹیکسٹ' میں پہلے سے چھپی ہوتی ہے۔

ایک دن روسی بھاشا کیندر کے آڈیٹوریم میں فیض نے علامہ اقبال پر اپنا پرچہ پڑھا، شاید انگریزی میں۔ یہ جانکاری سے بھرا ہوا پرچہ ان کی شاعری کے مزاج سے میل نہیں کھاتا تھا۔ ویسے انگریزی میں حاصل ان کے زیادہ تر نثر میں کئی بار نئی قسم کی علمیت حاوی دکھائی دیتی ہے۔ اقبال کی شخصیت اور ان کی شاعری میں فیض صاحب کی کچھ خاص اور بنیادی قسم کی دلچسپی لگتی تھی۔ کچھ کچھ ویسا ہی رشتہ تھا جیسا رویندر ناتھ ٹیگور اور نرالا کا یا پرساد اور مکتی بودھ کا۔ بعد میں یہ بھی پتہ چلا کہ اقبال بھی سیالکوٹ کے ہی تھے اور اقبال کے اثر کی گہری چھاؤں میں ہی ایک نئے ابھرتے ہوئے شاعر کے روپ میں فیض کا وکاس (نشو ونما) ہوا تھا۔

1978 میں، میں روہتک آ گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد بھی تقریباً دو سال تک میرا رشتہ جے این یو کے بھارتی بھاشا کیندر سے بنا رہا۔ روہتک میں ڈاکٹر اوم پرکاش گریوال انگریزی شعبہ میں پروفیسر تھے۔ انہوں نے اور ڈاکٹر بھیم سنگھ دہیا (جو اس وقت یونیورسٹی کے رجسٹرار بھی تھے) نے مجھ سے کہا کہ میں کسی طرح فیض صاحب کو روہتک لاؤں۔ میں نے ڈاکٹر محمد حسن (جو ایم اے میں میرے استاد بھی رہے تھے) سے کہا کہ فیض صاحب کو مجھے روہتک لے جانا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں اگلے دن 11 بجے سینٹر میں ان کے کمرے میں آ کر فیض صاحب سے خود ہی بات کر لوں۔

شروع میں محمد حسن صاحب سے میرا رشتہ قطعی نپا تلا تھا، لیکن گہرا تھا۔ یوں وہ بات کرنے میں سخت کنجوس اور بے حد چوکنے شخص لگتے تھے لیکن ان کے اندر بنوارے کا سچا درد اور ایک طرح کا دکھ تھا۔ نامور جی اور محمد حسن صاحب کے جے این یو میں آنے کے بعد ہندی اردو کے اسباق کو لے کر، خاص طور سے ہندی طالب علموں کو اردو کا کریڈٹ کورس کرنے یا درس کے ایک حصے کو دونوں

زبانوں کے لیے ملے جلے ڈھنگ سے تیار کرنے کو لے کر پہلی اسٹوڈنٹ فیکلٹی کمیٹی میں جو بحث ہوئی اس میں حسن صاحب اور ہماری ایک ہی رائے تھی۔ ترقی پسند لیکھک مہا سنگھ (جو انہی دنوں نئی شکل میں کھڑا کیا گیا مصنفین کا سنگٹھن تھا) کے ایمرجنسی کی حمایت میں نکلے پرپتر (سرکولر) پر چھپے اپنے نام کو لے کر ان کے من میں شدید پشیمانی تھی۔ انہی دنوں ایمرجنسی کو لے کر انہوں نے اپنا بے حد اچھا ناٹک 'ضحاک' ہمیں سنایا تھا۔

خیر، اگلے دن جب میں 11 بجے محمد حسن صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو فیض صاحب ان کی 'صدارتی' کرسی کے سامنے کی کرسی پر بیٹھے تھے۔ حسن صاحب نے مجھے دیکھتے ہی ان سے کہا، 'جناب یہی ہیں، جن کا ذکر میں کل آپ سے کر رہا تھا۔ منوہن صاحب ہمارے شاگرد ہیں۔ ان دنوں روہتک یونیورسٹی میں ہیں اور آپ کو روہتک لے جانا چاہتے ہیں۔' فیض صاحب نے، جواب تک کھڑے ہو گئے تھے، تپاک سے ہاتھ ملایا جیسے گلے مل رہے ہوں۔ ان کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں، بولے، 'روہتک! ارے بھائی روہتک تو ہمارا وطن ہے، ضرور چلیں گے۔ ویسے میں ابھی کچھ دن پہلے ہی چنڈی گڑھ (یا شاید کروک چھیتر) ہو کر آیا ہوں، لیکن روہتک ضرور چلنا ہے۔ ابھی تو باہر (فرانس یا شاید سوویت یونین؟) جانا ہے، لوٹ کر پروگرام بناتے ہیں۔' میں سوچتا رہ گیا روہتک اور ان کا وطن! کچھ دنوں بعد سمجھ میں آیا کہ ان کے دماغ میں متحدہ پنجاب کا پرانا نقشہ تھا، جس کا ایک اہم شہری مرکز شاید روہتک بھی رہا ہوگا۔ ضیاء الحق کے زوال سے پہلے دسیوں ہزار لوگوں کی ریلی میں بلند آواز میں فیض کا کبھی نہ بھلائے جانے والا ترانہ 'ہم دیکھیں گے، لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے' کی غیر معمولی ڈھنگ سے پیش کرنے والی مشہور پاکستانی گلوکارہ اقبال بانو بنیادی طور پر روہتک کی ہی رہنے والی تھیں۔ خیر ہم لوگ کچھ دیر ان کے ساتھ بیٹھے اور انہیں باہر ٹیکسی تک چھوڑا۔ باہر جو غیر ملکی صورت کی خاتون ان کا انتظار کر رہی تھیں شاید ان کی بیوی ایلس ہی رہی ہوں گی۔ افسوس ہے کہ فیض صاحب سے پھر کبھی ملاقات نہیں ہو پائی اور انہیں روہتک لانے کا ہمارا خواب جس میں شاید ان کا بھی کوئی خواب چھپا تھا، ادھورا ہی رہ گیا۔

اس بات پر جب غور کرتے ہیں کہ کیوں ہمارے وقت میں فیض کی موجودگی دنوں دن اتنی مضبوط، اتنی حقیقی اور اتنی لازمی ہوتی چلی گئی ہے تو سب سے پہلے یہی خیال آتا ہے کہ ان کی شاعری ہمارے اس بے چینی بھرے تاریخی دور میں انصاف کے سخت مقابلہ میں الجھی طاقتوں کے جذباتی اور اخلاقی لہروں کو، ان کی بے چینی اور اندرونی کڑھن کو، بے عزتی اور شکست کے بیچ بھی ان کے وقار کی تیز لو، بے حساب صبر، حوصلہ اور خوبصورتی کو بے مثال ڈھنگ سے واضح کرتی ہے، سچائی اور پورے پن کے ساتھ۔ یہی ایک چیز ہے جو فیض کو فیض بناتی ہے اور انہیں ہماری روح پرور دوست بنا دیتی ہے۔

میر اور غالب کے بعد اردو زبان میں شاید فیض ہماری یاد میں سب سے برتر اور گہرا شعور رکھنے والے شاعروں میں ہیں۔ پچھلی تین صدیوں میں دوسری ہندوستانی زبانوں کی شاعری میں بھی ان تینوں جتنی پختگی کتنے شاعروں میں ملے گی، کہنا مشکل ہے۔ اس کی وجہ جو سمجھ میں آتی ہے ہے وہ یہ کہ یہ تینوں شاعر صحیح معنوں میں اپنے اپنے وقتوں کی نمایاں پیداوار ہیں۔ یہ اتھل پتھل کورا 'تاریخی ضمن' ہی نہیں ہے، یہ ان کے اندر سے، ان کے نجی زندگی اور دل دماغ کے بیچوں بیچ سے انہیں بے چین کرتے ہوئے کچھ اس طرح سے گزری ہے کہ ان کی شخصیتوں کی اندرونی بناوٹ میں رچ بس گئی ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ تینوں اپنے اپنے طرز سے شدید اخلاقی گراوٹ، بے عزتی اور سنگدل حالات میں آدمی کی عظمت کو قائم رکھتے ہیں، شدید اندرونی تکلیف و کڑھن سے گزر کر اس کی پوری قیمت چکاتے ہیں لیکن اس کا پورا دعویٰ رکھتے ہیں۔ اس طرح تینوں ہی شخصیتیں ذلیل کرنے والے اور کچلنے والے حالات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ یہی ان کی مزاحمت ہے۔ یہ مزاحمت فقط ان کے اپنے جان بوجھ کر چنے ہوئے یا حمایت کی وجہ سے پیدا ہوئی، ایسا بھی نہیں ہے۔ یہ ان کے لیے لگ بھگ ایک 'بلفائٹ' میں الجھے، گھرے اور اپنی حفاظت کی کوشش میں لگے ہوئے شخص کی مجبوری کی طرح دوسرا بدل نہیں تھا اور لازمی تھا۔

دلچسپ پہلو یہ ہے کہ تینوں غزل کے شاعر ہیں۔ غزل ایک قسم کا 'لیرک' ہی مان لیا گیا۔

(حالانکہ یہ دھارنا (رائے) پوری طرح سے صحیح نہیں ہے) لیکن انہوں نے غزل کے آتم پرک (subjective) ڈھانچے میں ایک 'کلاسیکی' انداز پیدا کیا۔ یہ کلاسیکی قسم کی اعلیٰ شاعری 'فنومنل' زاویہ پیدا کرنے والی اس بنیادی نظر کی مانگ کرتی ہے جو عظیم ٹریجڈیوں میں ہمیں اکثر دکھائی دیتی ہے (مرزا غالب کے یہاں شاید یہ چیز سب سے زیادہ ہے)۔ اس خوبی کے بعد غزل صرف ایک دل کو چھونے والا احساس یا کورا 'لیرک' نہیں رہ جاتا۔ وہ چاہے احساس کے پردے پر ہی سہی اپنے دور کے عظیم ناٹک کی اندرونی کشمکش کے جہاں تہاں کوندنے والے عکس دکھاتی چلتی ہے۔

خود فیض نے غزل کے اس شاعری کے اس غیر معمولی چمتکاری لچیلے پن کے بارے میں کہیں لکھا ہے کہ ہر ایک محدود شکلوں میں اور ایک روایت میں بندھی بندھائی الفاظ اور اندازوں کے دائروں کے اندر غزل کیسے نئے نئے معنی اور ایک ساتھ پرت در پرت معنویت پیدا کرتی اور کھولتی ہے اور نئے روپ بنا لیتی ہے۔ کیسے اس میں معنی کی نئی ہلکی گونجیں پیدا ہوتی ہیں اور سنائی دیتی ہیں۔ فیض نے یہ بھی بتایا ہے کہ شاید اس لیے یہ نازک شاعری، اٹھائی گیری، فریب اور طرح طرح کے غلط استعمال کے لیے بھی زیادہ کھلا ہوا ہے۔ ایک جیسی لگنے والی اندازوں و الفاظ کی وجہ سے اچھی غزل اور خراب غزل کے درمیان فرق کی تمیز پیدا کرنا تھوڑا مشکل ہو سکتا ہے۔

پورا جائزہ لیتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ میر، غالب اور فیض اس لیے اہم ہیں کہ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ نہ صرف اپنے نجی احساس کی بلکہ اپنے اپنے بدلتے وقتوں کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان کی نمائندگی کرنے والی موثر آواز بن جاتے ہیں۔ انسانی حالات کی اسی بنیادی احساس دلانے والی گرفتگی وجہ سے ان کی ہلکی گونجیں ان کے وقتوں کے باہر بھی کبھی کبھی سنائی دیتی ہیں۔

میر کا زمانہ ایک بستی کے اکھڑنے کا زمانہ ہے (کیسی کیسی صحبتیں اکھڑ گئیں): اپنے ہی اندر دھماکوں کے درمیان اپنے ہی ملبے میں دھنستے تباہی و بربادی کے ان دنوں میں تمام لوٹ پاٹ، افراتفری اور بدحواس آپا دھاپی کے درمیان شاہی اعلیٰ طبقے کے ایک نمائندہ کے طور پر میر (کسی حد تک پنے کھلے صوفیانہ مزاج کی وجہ سے بھی) اپنے دور کی ضلالت اور بے رحمی کے تکلیف دہ احساس سے

گزرتے ہیں۔ ان کی غمگین روح اس نقصان کا بوجھ اٹھاتی ہے اور اسے شعروں میں ڈھال دیتی ہے۔ یہ بھی ایک ان حالات کی عکاسی ہی ہے۔ اگلی صدی میں، نوآبادیاتی فتح کے دور میں، اسی بچے بچائے شاہی اعلیٰ طبقوں کے بجھے ہوئے نشانوں کے آخری اَوشیش (کھنڈر) کی طرح مرزا غالب ایک زیادہ اجڑی ہوئی زمین پر کھڑے ہوئے اسی طرح کے اخلاقی گراوٹ، مورد الزام، گم ہونے کے احساس سے گزرتے ہیں اور ذاتی دُکھ میں گھر کر گھٹتے اپنے وجود کے ساتھ آدمی کے وقار کی لو کو بچاتے اور ان حالات کی عکاسی کرتے چلتے ہیں۔

فیض کا وقت اور فیض کا جیون قطعی الگ تھا۔ ان کا رنگ منچ اور اس رنگ منچ کے کردار الگ تھے۔ کل ملا کر فیض کا دور تواریخ کی مستقبل تحریکوں کی حکمت عملی کا دور ہے۔ پھر بھی فیض کی عمر کا لمبا سفر کبھی کبھی غالب کے تضادوں سے بھری زندگی کی یاد دلاتا ہے۔

خاندانی طور سے ایک بھومی ہین پریوار میں پیدا ہوئے فیض کے والد نے بھی اپنی زندگی کی شروعات چرواہے اور قلی کی طرح کی تھی، لیکن اتفاق سے ان کے دن پھرے اور وہ ڈرامائی انداز سے افغانستان کے بادشاہ کے یہاں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہو گئے۔ فیض کے ہی لفظوں میں انہوں نے کافی دلچسپ زندگی گزاری۔ ایک دن پھر لندن سے وکالت کی تعلیم پا کر ایک بیرسٹر کی حیثیت سے ہندوستان واپس آئے۔ فیض کی ابتدائی زندگی چھوڑ دیں تو ان کے حصے میں زیادہ سے زیادہ والد کے مرتبہ کی 'جلی ہوئی رسّی' کے کچھ بل ہی آئے ہوں گے۔

پہلی عظیم جنگ کے بعد سامراجواد مخالف ترنگوں سے آندولت دنیا میں فیض نے ہوش سنبھالا۔ ان کے بچپن کا دور سوویت کرانتی کی کامیابی اور عدم تعاون اور خلافت آندولنوں کی ہلچلوں کے گواہ بنے اور قومی آزادی سنگرام کے محبوبیت کے گہرے اثرات اور بلند خیالات کو جذب کرتے ہوئے گزرے۔ 1929 سے شروع 'گریٹ ڈپریشن' (عظیم مندی) کا اپنے ضمن میں فیض نے خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ وہ تب تقریباً اٹھارہ سال کے نوجوان تھے۔ اس مندی نے جہاں ایک طرف لوگوں کو بھکمری کے کگار پر پہنچا دیا اور ان کے سامنے بھی زندگی بسر کرنے کا سوال اٹھ کھڑا ہوا۔ وہیں دنیا میں

اس سے فاشزم کے ابھار کے لیے ایندھن کا کام کیا۔ ولیش میں آزادی کی دن پہ دن تیز ہوتی جدو جہد اور یورپ میں جنگ کے خلاف اور امن کے حق میں اٹھی زوردار لہروں کے گہرے اثر میں فیض انہیں دنوں آئے۔ اسی درمیان کمیونسٹ آندولن اور مارکسواد سے بھی ان کا رشتہ جڑا۔ یہ فیض کے خود نمائی کے اہم سال تھے۔ ہندوستان میں ترقی پسند ادبی۔ تہذیبی تحریک اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل دینے والی صفِ اوّل کی شخصیتوں میں سے فیض بھی ایک تھے۔ اس شروعاتی دور کی حوصلہ افزائی، مقصد اور خواب ہی فیض کی شخصیت کی دُھری (محور) بن گئے۔ فیض کی شاعری اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ یہ چیزیں ان سے کبھی دور نہیں ہوئیں اور ان کے لیے کبھی جھوٹی نہیں پڑیں۔ ان کے چشمے ان کے یہاں کبھی سوکھے نہیں، مشکل سے مشکل وقت میں بھی نہیں۔

1941 میں جب فیض کا پہلا مجموعہ نقشِ فریادی شائع ہوا تو اس میں ان کے اندرونی دنیا کے نقشے کی شروعاتی نشاندہی ہو گئی۔ اس مجموعہ میں ان کی 1928 کے بعد کی ابتدائی رچناؤں سے لے کر، ترقی پسند آندولن کی حوصلہ افزائی (inspiration) سے ان کے رشتہ بنانے تک کا لمبا سفر ہے۔ ان میں سے پہلے دور کی کئی رچناؤں کی محرک شکتی ہے جو زیادہ تر نجی قسم کی ہے اور تیزی سے چڑھتی ہے اور گرتی ہے۔ ان میں لگتا ہے کہ شاعری کی ایک عمر ہے اور 'باہر' ابھی زیادہ تر باہر ہی ہے، 'اندر' نہیں آیا ہے۔ نجی ابھی تک نجی ہی بنا ہوا ہے۔ حالانکہ اپنے دور کی اہم دِشا (سمت) کے مطابق شاعر نے باہر کی دنیا کی تلخ حقیقت اور اخلاقی تقاضوں سے اپنے جذباتی سنسار کا میل کرنا شروع کر دیا ہے۔ لیکن اس طرزِ عمل میں شاعری کو خود کو بار بار سمجھانا بجھانا پڑتا ہے۔ 'میرا دل غمگیں ہے تو کیا، غمگیں یہ دنیا ہے ساری' اور 'یہ دکھ تیرا ہے نہ میرا ہم سب کی جاگیر ہے پیاری' اس لیے 'کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں، بعد میں سب تدبیریں سوچیں'۔ ایک طرف 'اپنانے' کی یہ جدوجہد چلتی ہے تو دوسری طرف ایک اور ہی نجی اُدھیڑ بُن چلتی رہتی ہے جو کبھی بھی کہہ اٹھتی ہے، 'ہو چکا ختم عہد ہجر و وصال زندگی میں مزہ نہیں باقی' یا 'اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو، اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا'۔

'نقشِ فریادی' میں ہی فیض کی عوام میں بیحد مقبول نظم 'مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ

مانگ' شامل ہے۔ یہ نظم ترقی پسند تحریک کی اس وقت تک کی مین اسٹریم کی ان ڈھیر ساری تخلیقات کے سانچے ہی میں ڈھلی ہوئی ہے جن میں کئی بار جذباتی اصرار اپنی جانچ کیے بغیر بے حد ڈرامائی انداز کی مدد سے اور اخلاقی قدروں کا سہارا لے کر ہمدردی کا نیا ڈھانچہ کھڑا کرنا چاہتے ہیں اور 'نیائے چیتنا' (منصفانہ فکر) کے مطابق قائم ہونا چاہتے ہیں۔ نقشِ فریادی میں ہی فیض نے ایک نئے شاعری اس قدرتی لڑکھڑاہٹ کو پار کر لیا تھا۔ 'بول کے لب آزاد ہیں تیرے' جیسے ترانے یا 'دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے' جیسی غزلیں اسی مجموعہ میں شامل تھیں۔

نقشِ فریادی کی ایک غزل میں فیض کا یہ شعر ہے:

فیض تکمیلِ غم بھی ہو نہ سکی
عشق کو آزما کے دیکھ لیا

لیکن ہم جانتے ہیں کہ عشق کی مشکل آزمائش ابھی شروع ہی ہوئی تھی اور تا زندگی جاری رہی۔ اسے ابھی کئی پُر خطر راستوں سے گزرنا تھا۔ تکمیلِ غم بھی خوب ہوئی لیکن پھر بھی کم ہی ٹھہری۔

آزادی کے بعد قومی تحریک کے بکھراؤ کے برسوں میں، خاص کر 50 کے دشک (دہائی) میں ترقی پسند تحریک ختم ہونے لگی اور آہستہ آہستہ کم سے کم ایک بار پورا آندولن ہی بکھر کر منتشر ہو گیا۔ 'آخری شب کے ہم سفر' اپنا اپنا سفر ختم کر کے سُستانے کے اپنے ٹھکانے ڈھونڈ رہے تھے۔ کوئی کسی کنارے لگا، کوئی کسی اور کنارے۔ آہستہ آہستہ اچھی خاصی تعداد میں لوگ لالچ یا خیالاتی دباؤں اور تاثرات میں آئے اور خاموشی سے کہیں اور چلے گئے۔ اردو- ہندی کے کتنے ہی ترقی پسند، 'اپٹا' اور 'پرتھوی تھیٹرس' کی کتنی ہی پرچھائیں (شخصیتیں) جو کبھی اس تحریک کا پرچم اٹھائے گاؤں، قصبوں کی خاک چھانتی پھرتی تھیں، ایک دوسری ہی دنیا میں جا بسیں۔ نہ جانے کتنے کلاکار، تہذیب کے کمرشیل ڈھانچوں میں جذب ہو گئے یا پھر فلم صنعت کے وشال اُدر (پیٹ) میں ٹھیک ٹھیک سما گئے۔ کرانتی کا خیال اب کوئی خاص خلل پیدا نہ کرتا تھا۔ ان شخصیتوں نے ان نئی جگہوں کو بھی کچھ وقت کے لیے اپنی جلوہ گری سے روشن ضرور کیا، لیکن ایک آندولن جس کی جڑیں معمولی لوگوں کی ٹھوس زندگی

میں، ان کے دکھ درد میں، ان کے سپنوں اور روزانہ کی جدوجہد میں تھیں، ایک بارگی گم ہو گیا۔

لیکن فیض صاحب کا معاملہ کچھ الگ تھا۔ ان کا درد بھرا لمبا اور مشکل سفر ابھی بچا ہوا تھا جسے انہیں تقریباً اکیلے ہی طے کرنا تھا۔ الگ پاکستان کے وجود کو فیض نے قبول کر لیا تھا اور جنوری 47 میں ہی پاکستان ٹائمز کا سنپادن (مدارت) کرنے لاہور آ چکے تھے۔ حالانکہ اگست 1947 میں فیض لکھ رہے تھے، 'یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر، وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں'۔ لیکن شاید تب انہیں بھی اس بات کا علم نہ رہا ہوگا کہ آنے والے دن اس قدر تکلیف دہ ہوں گے۔ فیض کی زندگی کا ایک بہت ہی اہم اور پیچیدہ پہلو یہ ہے کہ بٹوارے کے بعد وہ پاکستان ہی میں رہے۔ لہٰذا آزادی کی وہ خوش فہمیاں اور جھوٹی تسلیاں ان کے حصے میں نہیں آئی تھیں جو ترقی پسند آندولن سے نکلے ان کے کسی زمانہ کے ہمعصر ساتھیوں کو ہندوستان میں آسانی سے نصیب تھیں۔ زیادہ تر وقت انہوں نے پاکستان میں جمہوریت کو کچل کر رکھنے والے امریکہ پرست ظالم جاگیردارانہ فوجی گٹھ جوڑ کی دم گھونٹنے والی سرنگوں میں شدید توڑ دینے والے لمحات سے گزرتے ہوئے یا ایک دربدری کی زندگی جیتے ہوئے بتایا۔ آزادی ان کے لیے ابھی بھی ایک خواب تھی۔ فوج میں شامل ہو کر فاشزم کے خلاف لڑنے والے فیض کے لیے فاشزم لگ بھگ تمام عمر ایک زندہ حقیقت رہا، لیکن بڑی بات یہ تھی کہ شدید الگاؤ اور اکیلے پن کی ان مشکل صورتحال میں فیض نے اپنے انوکھے دور کی لو کی حفاظت اپنی آبرو کی طرح کی، اسے نہ صرف جلائے رکھا بلکہ اس پورے دور میں ان کے دل میں اس کی چمک اور بھی زیادہ صاف، جاں پرور ہو گئی۔ 'غرورِ عشق کا بانکپن' کم نہ ہوا، اُلٹا بڑھتا گیا۔ یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ انصاف کے لیے لڑنے والے لوگ طبقاتی اور بورژوا خوش حالی کی بھول بھلیوں میں ہی گم نہیں ہوتے، دمنکاری (repressive) حالات میں ناامیدی کے سامنے بھی الگ تھلگ اور لاچار ہو کر ٹوٹ جاتے ہیں اور جھک جاتے ہیں۔ خاص کر تب جبکہ نظر کے سامنے منظم مزاحمت کی کوئی یقینی صورت حال دکھائی نہ دیتی ہو۔ اس لیے فیض کو ہی اس ثابت قدمی کے لیے بھرپور داد دینی چاہیے کہ وہ عشق کے اس سخت امتحان میں سرخ رُو ہو کر نکلے۔

'نقشِ فریادی' کے بعد فیض کی شاعری کو جیسے اپنے آپ کو پالیا۔ شاعر جیسے اپنے اصل میدان میں آ پہنچا ہو۔ جیل کی زندگی نے منچ کو ٹھیک ٹھیک باندھ دیا اور انہیں اپنے وقت کے ناٹک کے درمیان اس مرکزی جگہ لا کھڑا کیا جہاں سے وہ اپنے شدید اندرونی جدوجہد کے ذریعے بھی بیسویں صدی کے غیر وسیع / بدحال نئے آزاد دیشوں کے مخصوص جدوجہد کی روپ ریکھا کی طرف اشارہ کر سکتے تھے اور آزادی اور جمہوریت کے روشن سوال کی دکھ اور المیہ کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کر سکتے تھے۔

'دستِ صبا' (1952) اور 'زنداں نامہ' (1956) اور اس کے بعد 'دست تہہ سنگ' (1964) میں فیض کی شاعری کی تمام خوبیاں ایک تخلیقی ڈھانچے میں ڈھل کر اپنی بنیادی محور و ابھار کے ساتھ رونما ہوتی ہیں۔ اور اپنی پوری آزمائش کرتے ہوئے بطور شاعر ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو مکمل طور پر سامنے لاتی ہیں۔ یہ چیز بعد تک آنے والے دوسرے مجموعوں میں بھی ہم دیکھتے ہیں۔

اس پورے لمبے دور کو ایک ساتھ دیکھیں تو فیض کی طاقت اس بات میں چھپی لگتی ہے کہ وہ انصاف کے لیے مزاحمت کی سچائی، سندرتا اور جٹلتا کو پوری گہرائی سے سمجھتے ہیں، اس کا سَرلی کرن (simplification) نہیں کرتے۔ اس عشق کے غرور، اس کی آبرو اور شان کو وہ دل سے جانتے اور سمجھتے ہیں، اس کے تمام بوجھ اور جان لیوا تقاضاوں کے ساتھ۔ اس درد کا سودا انہوں نے اپنے انسانی وقار کی حفاظت کی زیادہ گہری خوشی کے لیے کیا ہے، یہ جانتے ہوئے کہ اس لڑائی میں کامیابی کی یا منزل پالینے کی کوئی گارنٹی نہیں۔ اس میں بار بار کی ناکامی کوئی خاص معنی نہیں رکھتی یہ مشق ہی خود میں کامیاب ہے۔ فیض ہی کہہ سکتے تھے 'فیض کی راہ سر بہ سر منزل، ہم جہاں پہنچے کامیاب آئے'۔ اس مشکل راستہ کا تمام ادھورا پن اس کے تمام پیچ و خم کے ساتھ انہیں منظور ہے۔ بیگانگی، اداسی، اکیلے پن، بے چینی اور بے بسی کے بھیانک ریگستان کو وہ جس بڑپّن، صبر اور حوصلے سے پار کرتے ہیں اور خودداری کے ساتھ اپنے خواب کی پاکیزگی اور اپنی عاشقی کی عظمت کو ہر قیمت پر بچانا چاہتے ہیں وہ فیض کی شعری شخصیت کی پختگی کی اپنی ہی ایک مثال ہے۔

اپنی ایک نظم میں فیض نے شاعر کی اندرونی حالت کو 'ظلم اور انصاف کا میدانِ جنگ' (طبعِ شاعر ہے جنگ ہائے عدل و ستم) کہا ہے۔ کہنا غیر ضروری ہے کہ سب سے زیادہ یہ فیض کی اپنی تاثراتی دنیا کا ہی بکھان ہے۔ ثبوت کے ساتھ وہی کہہ سکتے تھے 'دکھ بھری خلق کا دکھ بھرا دل ہیں ہم'۔ ہم آگے کی ان کی تمام شاعری میں 'ظلم' اور 'انصاف' کے اس شدید جنگ کی بدلتی شکلوں کے ساتھ شاعر کی جنگجو عزم کی کئی سُندر اور شاندار عکس / روپ دیکھتے ہیں۔ بار بار ہار کر بھی اس 'بدلی ہوئی بازی' میں شاعر ہارتا نہیں، اپنے دکھ اور تنہائی کو ایک 'ٹریجک ہیرو' کی شان، عظمت اور بڑپّن کے ساتھ قبول کر لیتا ہے، اپنی سزا کو قبول کرتا ہے اور جھکنے سے انکار کرتا ہے۔ دراصل فیض ایک ایسے شاعر ہیں، جنہوں نے منصور اور فرہاد کی پرانی روایات سے لے کر قربانیوں سے بھری مزاحمت کی تمام سامراجی مخالف، فاشزم مخالف نجات دہندہ ماڈرن روایات کو اپنایا اور ان کی قیمت سمجھتے اور چکاتے ہوئے اُن کے سنواہک (محرک) بنے۔ ہم جانتے ہیں کہ ایشیا، افریقہ، لاطینی امریکی اور تمام دنیا کی آزادی کی متمنی عوام کی جدوجہد کے ساتھ کیسے ان کے دل کی دھڑکنیں پیوست تھیں۔ وہ سب سے اچھی طرح یہ جانتے تھے کہ اندر سے یہ ایک ہی لڑائی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ اپنے اس سفر میں فیض کو کبھی یہ لگا کہ 'اٹھے گا جب جامِ سرفروشاں / پڑیں گے دار و رسن کے لالے / کوئی نہ ہوگا کہ جو بچالے' تو کبھی ایسا بھی وقت رہا اور زیادہ تر رہا، کہ لگا، 'نہ رہا جنونِ رخِ وفا / یہ رسن یہ دار کروگے کیا'۔ لیکن فیض ان سب حالات کے درمیان اپنی خودداری کو بچانا جانتے ہیں۔ ان کی خوبصورت نظم 'آج بازار میں پا بہ جولاں چلو' ظالموں کے نظام میں اپنے پریم کی سندرتا، شان اور ذاتی عظمت کو جس طرح پورے قد میں سامنے لاتی ہے اور اس کا جشن مناتی ہے، اس سے فیض کی عاشقی کی گہرائی اور اخلاقی تڑپ کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ نظم ظلم اور انصاف کے درمیان کے میدانِ جنگ کو اسی طرح ایک تاریخی تھئیٹر میں بدلتی ہے، جیسے مکتی بودھ کی کویتا 'بھول غلطی'۔

فیض سچے وطن پرست اور سچی بین الاقوامیت کے پرستار تھے۔ دنیا بھر کی عوامی جدوجہد کے ساتھ اتحاد ظاہر کر کے قوم پرست ہو جانا آسان ہے لیکن قوم پرست کا اصل امتحان تب ہوتا ہے

جب آپ کا ملک ایک جنون سے بھری ہوئی جنگ میں جھونک دیا جاتا ہے۔

یہ قابل ذکر ہے کہ 1965 میں ہندوستان کے ساتھ غیر ضروری جنگ کا اور 1971 میں بنگلہ دیش پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیے فوجی حکمرانوں کے ذریعے کی گئی قتل و غارت کا فیض نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ مخالفت کی ہے اور اپنے ملک کی جنونی کیفیت کو بھگتا جبکہ 1962 میں چین کے ساتھ ہندوستان کے جنگ کے حق میں ترقی پسند تحریک کے ان کے ہندوستانی دوستوں کا ایک اچھا خاصہ طبقہ اندھی قومی مہم کا شکار رہا۔

ایک بات جو خاص طور پر سمجھنے کی ہے، وہ یہ کہ فیض کا خود کے سروکاروں سے تعلق کورا تخیلی، اخلاقی یا کوئی رسمی رشتہ نہیں ہے۔ وہ ان کے خود کے سروکار (تقاضے) ہیں، خود کمائے ہوئے، 'آرگینک' اور متبادل۔ ان میں ان کی حقیقت اور نجی 'اسٹیکس' تھے۔ سماجی سرورکار اور نجی سروکاروں میں، تاریخی فہرست اور نجی فہرست میں ان کے لیے کوئی فرق نہ تھا۔ اس لیے 'ریٹرک' (لفظی ریل پیل) کا سہارا لینے کی ضرورت انہیں کبھی محسوس نہیں ہوئی جبکہ ان کے تخلیق کے دور میں اس کا چلن عام تھا۔ ایک امورت انقلابی رومان، امورت دیش پریم یا امورت آوارگی اور دیوانگی کی رونما اداؤں کی تشبیہات کے لیے یہ کافی مفید ہے۔ 'ریٹرک' کئی بار ایک کرم کانڈ کے خول یا لباس کی طرح ہوتا ہے جسے پہن کر دیے ہوئے 'پارٹ' کو ادا کرنے کی سہولیت کافی مل جاتی ہے لیکن اس شاعر کا کام کورے پرفارمینس سے کیسے چل سکتا ہے جس کا اپنا تجربہ اور شعور ایک جاری اور بے مثال وجود رکھنی والی جدوجہد کے ذریعہ تشریح کیا جا رہا ہو اور اسی کو چلانے کے لیے اسے زبان کی ضرورت پڑتی ہو۔ فیض کے الفاظ اگر بجنے کے بجائے گونجتے ہیں، سچے لگتے ہیں اور دل میں اترتے ہیں تو اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ اصل کی طاقت لے کر آتے ہیں۔ ان میں وہی تڑپ اور دل آویزی ہے جو فیض کی اپنی جدوجہد میں تھی۔

جس چیلنج سے فیض کا سامنا تھا، وہ آج اور بھی بھیانک ہو کر سامنے ہے۔ ان کا خواب اوپر اوپر ٹوٹ گیا لگتا ہو، اس کے باوجود تاریخ کے حمل میں اس کی دھڑکنیں نئی زندگی کا پیغام دیتی ہیں۔ اس

وقت کا سنگھرش زیادہ شدید اور مشکل ہے، لیکن اسی تناسب میں مزاحمت کے امکانات زیادہ بھرپور وسیع اور انجام خیز ہیں۔ اس شرم آلود شکست آمیز دور میں بھی تمام تھکن، اداسی، محرومیت اور تکلیف دہ اکیلے پن کے درمیان فیض کا اندرونی سنگھرش، ان کا عزم، صبر، ان کی پختہ طرف داری، ان کی ناشکست خوردہ مزاحمت ہماری یادداشت میں اپنی سچائی اور جانثاری کے ساتھ تب تک زندہ رہے گی جب تک یہ لڑائی جاری ہے۔ کٹھن عاشقی کی فیض کی یہ روایت آنے والے دور میں ہمارے ساتھ گامزن رہے گی۔

فیض: کچھ لمحے، کچھ یادیں

ظہور صدیقی

فیض ان ادیبوں میں سے ایک ہیں جن کے بارے میں جتنا بھی لکھا جائے کم ہے لیکن لکھنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ الفاظ کا انبار ہی لگاتے جائیں۔ ہر تحریر وزنی ہونے کے لیے ثبوت چاہتی ہے۔ فیض ہمارے وقت کے نہ صرف ایک عظیم فرد تھے بلکہ اُن کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ جو کچھ لکھتے تھے یا بولتے تھے وہ حقیقت نگاری سے مرصع ہوتی تھی۔

'ہری گھاس اور سرخ گلاب' ہمیں اپنی کتابوں کے ذخیرے میں نظر آئی تو ہمیں یاد آگیا کہ اختر باجی (اختر جمال) نے یہ کتاب ہمیں دیتے ہوئے کہا تھا "اس کتاب میں میں نے اپنی مرحوم بیٹی (تزئین) کے بارے میں ہی نہیں لکھا بلکہ تمہیں کچھ مشہور ادیبوں کے بارے میں تھوڑا بہت ضرور ملے گا۔"

اردو ادب میں اختر جمال کا ایک مقام ہے۔ محمد طفیل (مشہور رسالہ نقوش، لاہور، کے مدیر) ان کے بارے میں لکھتے ہیں: "جب اختر جمال کو دیکھا تو قصہ جمال والا تھا مگر اس خاتون کی پاکیزگی اور اس خاتون کی بوھیا سوچ نے حیرت میں ڈالے رکھا۔ یہ ایک ایسی خاتون ہیں جن کی میرے دل میں عزّت ہے۔ اگر یہ مجھے بھائی کہتی ہیں تو میرے لیے بھی اس سے بڑا انعام اور کوئی نہیں۔" (نقوش 843، 1966) بھلے ہی نقوش کے بارے میں ہندی ادب سے جڑے ہوئے لوگوں میں بہت کم اس رسالہ کے بارے میں جانتے ہیں لیکن اردو ادب میں اس نے اپنی گہری چھاپ

چھوڑی۔ یکم مارچ 1948 میں اس کا پہلا شمارہ نکلا اور یکم مئی 1951 میں محمد طفیل نے اس کی ادارت سنبھالی اور اس کے بہت سارے شمارے درخشاں ستارے بن گئے۔

اسی نقوش کے ایک شمارے میں فیض کو لکھا ایک خط بھی ہے:

"محترم سلام مسنون!

اب آپ کو کوئی خط لکھے تو کہاں لکھے، جیل میں؟ میری یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ جیسا شریف آدمی بار بار جیل کیوں جاتا ہے۔ ضرور کوئی بات ہے جس کا علم ہمیں نہیں ہے؟ آپ کے جیل جانے سے بہت سے نقصان ہوتے ہیں۔ بیوی، بچے آپ کی شفقت اور محبت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ احباب آپ کی صورت دیکھنے اور میٹھی میٹھی باتوں کو ترس جاتے ہیں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آئندہ یہ صدمہ کسی کو بھی نہ سہنا پڑے۔ آپ کی نظر بندی کا خوش کن پہلو بھی ہے وہ یہ کہ آپ جیل جا کر شاعر بن جاتے ہیں اور باہر آکر ایڈیٹر، باپ، شوہر اور دوست۔ پہلی نظر بندی میں 'دستِ صبا' اور 'زنداں نامہ' اردو ادب کو ملے تھے۔

اب کے بھی پرستار کچھ آس لگائے بیٹھے ہیں۔ خدا کرے اب کے بھی آپ کا جیل جانا ادب کے لیے مفید ہو ورنہ میری طرح اور بھی کئی لوگوں کو صدمہ ہوگا۔"

(محمد طفیل کا خط فیض کے نام: 9-3-1959)

آیئے پھر لوٹ چلتے ہیں 'ہری گھاس اور سرخ گلاب' کی طرف۔ اختر جمال نے بی بی گل، جو فیض کی پہلی ماں کی بیٹی تھیں، سے بات چیت کر کے اپنا مضمون 'بی بی گل سے ایک مکالمہ' کو اس کتاب کی زینت بنایا۔

جہلم میں آکر فیض کے والد نے بیرسٹری شروع کی لیکن پھر وہ سیالکوٹ پہنچ گئے۔ بی بی گل نے اختر جمال کو بتایا:

"سلطان محمد خاں سیالکوٹ آئے تو گھر میں ایک مجمع جمار ہتا تھا۔ ایک مَن آٹا روز پکتا تھا، چھ بھینسیں اور گھوڑا گاڑی تھی جسے چار گھوڑے کھینچتے تھے۔ غرض فیض کی پرورش اس ماحول میں بہت ناز

دنعت میں ہوئی۔ اس وقت گھر میں چار بھائی اور چار بہنیں تھیں (179) اور سب لوگ بہت مل جل کر رہتے تھے۔ گھر میں اسلامی ماحول تھا۔ نماز باقاعدگی سے پڑھی جاتی تھی، روزے رکھے جاتے تھے، کلام پاک کی تلاوت صبح کے وقت ہوتی تھی۔ فیض نے بھی دو سپارے حفظ کیے اور آنکھیں دکھنے آگئیں تو حفظ کرنا چھڑوا دیا۔

"فیض سے کالج سے چھٹیاں ملتیں تو وہ اپنے دولہا بھائی، بیرسٹر شجاع الدین (ان کی بہن بی بی گل کے شوہر) کے پاس دھرم شالہ پہنچ جاتے تھے۔ دھرم شالہ کے قیام میں فیض کا زیادہ تر وقت سیر و تفریح اور گرامفون ریکارڈ بجانے میں گذرتا تھا۔ پکے گانے بہت سنتے تھے...... (ایضاً 180)"

اور پھر بی بی گل بتاتی ہیں:

"بہت سے گانے مجھے یاد ہیں جو یہ لوگ سنا کرتے تھے۔ 'جمنا کے تیرا گی کلیجوا میں چوٹ' یا 'بسنت راگ'۔ کبھی کبھی یہ سب مل کر ایک گانا گاتے تھے، میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا (وہی، 181)۔ فیض اپنے بھانجے اور بھانجی کو بہت پیار کرتے تھے۔ انھیں میز پر مکہ مار مار کر کہنا سکھایا تھا: 'ٹوڈی بچہ ہائے ہائے۔ مال ولایتی بائیکاٹ' (181)

بی بی گل پھر ہمکلام ہوتی ہیں: 'ہمارے والد بھی انگریزوں سے متاثر تھے مگر اولاد پر الٹا اثر ہوا۔ فیض اپنے والد کے کہنے پر آئی سی ایس (ICS) کے امتحان کی تیاری کرنے لگے مگر امتحان سے پہلے ہیضہ ہوگیا اس لیے امتحان نہ دے سکے۔ پھر خیالات میں اتنی تبدیلی واقع ہوئی کہ انگریزوں کے اتنے خلاف ہوگئے کہ آئی سی ایس کا امتحان ہی نہیں دیا۔" (181)

بی بی گل نے ایک مزیدار بات بتائی:

"ایک سال فیض دھرم شالہ آئے تو ایک دلچسپ اتفاق ہوا، ایک دن چوڑی دار پاجامہ و اچکن پہن کر سیر کو نکلے تو کچھ ہندوؤں نے غلط فہمی میں ان کو گھیر لیا اور کہا، آپ کب تشریف لائے اور کہاں ٹھہرے ہیں؟ فیض نے جواب دیا، بیرسٹر شجاع الدین کے یہاں۔ اس پر لوگوں نے کہا ان کے یہاں ٹھہرنے سے مذہب بھرشٹ ہوتا ہے۔ اتنے میں کچھ عورتیں تھالوں میں مٹھائیاں سجا کر لے

آئیں۔ فیض بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر لوٹے۔ (181) اور انھیں بتایا کہ میں پنڈت نہرو نہیں ہوں۔ شجاع الدین کا سالہ ہوں اور میرا نام فیض احمد فیض ہے۔ (182)

"فیض کی ماں کو بھی ان سے بہت پیار تھا۔ انھیں فیض بہت پیارا تھا اور اس سے بہت توقعات وابستہ تھیں، ان کے جیتے جی فیض کو جو شہرت و عزت ملی اس سے بہت خوش تھیں لیکن جب وہ جیل گیا تو بہت پریشان تھیں۔ والد کے مرنے کے بعد گھر پریشانیوں میں گھر گیا لیکن فیض نے ان حالات میں بڑی سمجھداری سے کام لیا۔"

انہوں نے بتایا کہ "فیض کو ہمیشہ میلے ٹھیلوں سے دلچسپی رہی۔ اکثر میلے جایا کرتے تھے اور ان کو افغانی کھانے پسند تھے۔ شب دیگ، قورمہ پلاؤ، حبشی پلاؤ مگر کبھی خود فرمائش نہیں کی جو مل گیا وہ کھا لیا۔"

فیض کی صرف شاعری میں انسانیت سے لبریز جذبات نظر نہیں آتے بلکہ خاندانی رشتوں میں بھی ان کی جھلک ملتی ہے۔ حالانکہ بی بی گل ان کی پہلی ماں کی بیٹی تھیں مگر بی بی گل بتاتی ہیں: "فیض کو اپنے سب بھائی بہنوں میں مجھ سے سب سے زیادہ محبت تھی اور اپنے بہنوئی سے بھی بہت محبت کرتے تھے۔ بہنوئی کا انتقال ہوا تو کئی دن تک بالکل خاموش اور گم صم رہے اور کھانا بھی نہیں کھایا۔"

"انہوں نے ہمارے معاملات میں بھی ہمیشہ دلچسپی لی، بھانجی کو اسکول میں داخل کرایا اور مجھے سمجھایا کہ بچوں کو اچھی تعلیم دلوانی چاہیے۔ ہمیشہ ہر طرح مدد کی اور ہر ضرورت کے وقت نیک رائے دی اور نصیحت کی اور کنبہ کے بزرگ کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کیا۔"

اسی 'مکالمہ' کے آخر میں جب اختر جمال نے ایلس کے بارے میں بی بی گل سے پوچھا تو انہوں نے بتایا: "فیض کے لیے بہت سے رشتے آئے تھے مگر جہاں والدہ اور بہنیں چاہتی تھیں وہاں فیض نے شادی نہیں کی اور ایلس کا انتخاب کیا۔ والدہ نے مشرقی روایات کے مطابق انھیں دلہن بنایا، چینی بروکیڈ کا غرارہ تھا، گوٹہ کناری والا دوپٹہ، سرخ جوڑا۔"

آگے بی بی گل بولیں:

''ان کی بہت سادہ طبیعت ہے، بہت خلیق اور محبت کرنے والی ثابت ہوئیں اور انہوں نے سسرال میں قدم رکھتے ہی سب کا دل جیت لیا اور خاندان میں اس طرح گھل مل گئیں جیسے اسی گھر کی لڑکی ہیں وہی لباس اختیار کیا جو ہم سب پہنتے تھے۔(184) ہاں ساس و بہو کا رشتہ پیار اور ادب والا رہا۔ ساس نے بہو کو محبت دی اور بہو نے ساس کی عزت کی۔''(185)

اختر جمال اس نیک ہستی ایلس کی صورت و سیرت دونوں کی دیوانی تھیں۔ 'شاخِ گل' میں وہ لکھتی ہیں: ''وہ (ایلس) سب مہمانوں کو سوپ دیتی ہوئی بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ اس وقت میرا جی چاہا کاش میں نے انھیں ان کی جوانی میں دیکھا ہوتا''۔ یہ اس لمحہ کی بات ہے جب اختر جمال اور احسن علی خان، فیض اور ایلس کی شادی کی 31 ویں سالگرہ پر ان کے گھر پہنچے۔ لیکن اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے، فیض کی ابتدائی شاعری میں جو محسور کن حسن ہے اس کے واسطے سے ہم اس کی جنت تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔''(47)

اس سے پہلے اختر جمال ان پر فدا ہو کر کہہ چکی ہیں:

'''سلام لکھتا شاعر تمہارے حسن کے نام' لیکن اس حسن کے پیکر کو جینے کا حوصلہ بھی تھا۔ جیتی جاگتی زندگی میں ایلس نے قدم قدم پر دشواریوں اور مصیبتوں کا سامنا کیا۔''

اختر جمال نے سب سے پہلے دور سے ہی ایلس کو دیکھا۔ ان کے الفاظ میں:

''مسز فیض کو میں نے پہلی بار ان دنوں دیکھا تھا جب میں بی اے کا پرائیوٹ امتحان دے رہی تھی اور ریگل کے پاس کسی جگہ ایک بس سٹاپ پر دیر تک بس کے انتظار میں کھڑی رہتی تھی۔ وہاں سے ایک انگریز عورت دوڈھائی بجے کے قریب سائیکل پر جا رہی ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے اپنی ساتھی لڑکی سے کہا کہ انگریز عورتیں ہمارے ملک میں آ کر اتنا عیش کرتی ہیں ایک بیچاری یہ میم ہے مجھے اس پر بڑا ترس آتا ہے۔ پسینہ میں شرابور اتنی دھوپ میں ہر روز جانے کہاں جاتی ہے؟''

''میری ساتھی لڑکی نے کہا، ارے تم انھیں نہیں جانتی ہو۔ یہ تو مسز فیض ہیں۔''(43)

''ایلس کی زندگی میں سب سے پریشان کن وہ دن تھے جب فیض کو جیل میں ڈالا جانے لگا: ایک وطن پرست ایک عظیم انسان پر اخبارات نے ہر طرح کے الزام لگائے، فیض کو غدار اور وطن دشمن کے طور پر پیش کیا۔ ایلس ان کو دل کی گہرائیوں سے جانتی تھیں لیکن وہ سمجھدار تھیں زہر کے کڑوے گھونٹ پیتی رہیں اور اپنے بچوں کو پالتی رہیں اور بگڑے ہوئے حالات میں ثابت قدم رہیں۔''

'ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے'

یہاں فیض کے لکھے ہوئے کچھ جملے پیش کرنا مناسب ہوگا:

''چار برس کے لیے جیل خانہ چلے گئے۔ 'نقشِ فریادی' کے بعد دو کتابیں 'دستِ صبا' اور 'زنداں نامہ' اسی جیل خانہ کی یادگار ہیں۔''

فیض آگے لکھتے ہیں:

''جیل خانہ عاشقی کی طرح خود ایک بنیادی تجربہ ہے جس میں فکر و نظر کا ایک آدھ نیا دریچہ خود بہ خود کھل جاتا ہے۔ چنانچہ اوّل تو یہ ہے کہ ابتدائی شباب کی طرح حسیات یعنی sensations پھر تیز ہو جاتے ہیں اور صبح کی پو، شام کے دھندلکے، آسمان کی نیلاہٹ، ہوا کے گداز کے بارے میں وہی پہلا سا تحیر لوٹ آتا ہے۔ دوسرے یوں ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا کا وقت اور فاصلے دونوں باطل ہو جاتے ہیں۔ نزدیک کی چیزیں بھی بہت دور ہو جاتی ہیں اور دور کی نزدیک اور فردا و دی کا فرق کچھ اس طرح مٹ جاتا ہے کہ کبھی ایک لمحہ قیامت معلوم ہوتا ہے اور کبھی ایک صدی کل کی بات۔ تیسری بات یہ ہے کہ فراغتِ ہجراں میں فکر و مطالعہ کے ساتھ آرائے سخن کے ظاہری بناؤ سنگھار پر توجہ دینے کی زیادہ مہلت ملتی ہے۔''(کلیاتِ فیض، نسخہ ہائے وفا، 12-311، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1991)

[آجکل، ہندی۔ فیض جنم شتی وشیشانک، فروری 2011 سے شکریہ کے ساتھ۔ ہم شریک نشاط سیّدہ کی حوصلہ افزائی و مدد سے یہ مضمون اس منزل تک پہنچا اور انہوں نے ہی اس کا ترجمہ کیا ہے۔]

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ظہور صدیقی

جمالِ فکر و حسنِ شعر میں یکتا
بہت آئیں گے لیکن کوئی اس جیسا نہیں ہوگا
نہ اربابِ سیاست نہ سپہ سالارِ لشکر سے
کرو منسوب اپنے عہد کو فیض سخنور سے

—احسن علی خاں

(شعلۂ جاں، نقوش، اردو بازار، لاہور، 1991)

فیض پر ایک سُلجھا ہوا لیکھ لکھنا ناممکن تو نہیں لیکن دشوار ضرور ہے۔ آپ اپنی گردن کو جتنا بھی اٹھاتے جائیں فیض اس سے بالاتر ہوتے چلے جاتے ہیں، شبد (الفاظ) جو حقیقت نگاری کے لیے ضروری ہوتے ہیں ساتھ چھوڑتے نظر آتے ہیں اور پھر سمجھ کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ پھر بھی جو الفاظ اپنے جذبات اور سمجھ کے بل پر کھوج پائے ہیں ان کو ادھورے تجزیے کے طور پر قلم کی بھینٹ کرتے ہیں اور اس امید کے ساتھ کہ آنے والوں دانشور و ریسرچ اسکالر فیض کے رول اور کلام کو زیادہ علمیت کے ساتھ پیش کریں گے۔

1- فیض کا دور

فیض احمد فیض (13 فروری 1911 - 20 نومبر 1984) بیسویں صدی کے اس دور میں پیدا ہوئے جو اپنے تیز تضادات کے سبب تواریخ کے پنّوں پر ہمیشہ نمایاں رہے گا۔ ایک طرف سامراجواد کی بھیانک صورت تھی تو دوسری طرف ابھرتے سورج کی سرخ کرنیں اس کے پگھلتے ہوئے چہرے پر بار بار وار کر رہی تھیں۔ حق اور باطل کے بیچ جدوجہد میں روس میں سوشلسٹ نظام قائم ہوا لیکن یہ اَنتم (آخری) جنگ نہیں تھی، اس انسان دوست نظام کو چنوتی دینے کے لیے فاشزم کا بھوت کھڑا ہو گیا۔ لیکن انتہائی تباہی مچانے کے بعد اس دانو بھوت کو دھول چاٹنی پڑی۔

بیسویں صدی کے اس دور کی ایک اور خاصیت تھی قومی آزادی کی تحریکوں کا سرگرم ہونا، 1858 میں ہار کے بعد پھر ہندوستان نے انگڑائی لی اور آزادی کو حاصل کرنے کے لیے جیالوں کے کارواں نکل پڑے اور ان میں بھگت سنگھ جیسے شہید بھی ابھرتے ہیں۔

فیض ابھی ننھے سے بچے ہی تھے کہ پہلی عالمی جنگ 1914 میں شروع ہو گئی، اس جنگ میں سرمایہ دارانہ نظام کی ایک انتہائی خود غرض شکل اُجاگر (نمایاں) ہوئی۔ سرمایہ دارانہ ملک اپنے فائدہ کو محفوظ رکھنے یا بڑھانے کے لیے ایک دوسرے پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے، کل تک اپنی دنیا سے الگ رہنے والوں کو جاہل اور جنگلی جانور سمجھنے والے اس جنگ میں بے نقاب ہوئے۔

پھر بھی سرمائے کے ماڈرن دیوتا یہ سمجھتے تھے کہ بنیادی طور پر ان کا اقتصادی ڈھانچہ پربل (مضبوط) ہے لیکن 1929 میں ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب 'مہامندی' (گریٹ ڈپریشن) نے یو ایس اے کو دبوچ لیا۔ کل تک جو خود کو* کوبیر کا تاؤ سمجھے بیٹھے تھے اور اپنی سرمایہ داری پر نازاں تھے ان کو اب دن کے تارے نظر آنے لگے۔ شیئر مارکٹ لُڑھک گئی، پیداوار ٹھپ ہونے لگی اور بے روزگاری چھلانگیں لگانے لگی۔

یو ایس اے (USA) میں جو ہوا سو ہوا پر اس بھونچال سے یورپ کے کئی دیش بھی بچ نہیں

*(کوبیر: دھن کا دیوتا)

پائے اور اس طرح اس اقتصادی کساد بازاری کے شکار ہو گئے اور اس نے عالمی صورت اختیار کر لی۔ البتہ سماجوادی روس بچا رہا۔ بھارت جیسے دیش بھی اس مہامندی (کساد بازاری) کی لپیٹ میں آ گئے۔ فیض ان قلم کاروں کی صف میں نظر آتے ہیں جن کے دماغ پر 1929 میں شروع ہوئی مہامندی کا اثر پڑا۔ فیض اس اقتصادی بحران کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

''پھر دیش پر عالمی کساد بازاری کے سائے ڈھلنے شروع ہوئے۔ کالج کے بڑے بڑے بانکے تیس مار خاں تلاشِ معاش میں گلیوں کی خاک پھانکنے لگے۔ یہ وہ دن تھے جب یکا یک بچوں کی ہنسی بجھ گئی۔ اجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے اور اچھی خاصی شریف بہو بیٹیاں بازار میں آ بیٹھیں۔ گھر کے باہر یہ حال تھا اور گھر کے اندر مرگِ سوزِ محبت کا کہرام مچا تھا۔''

فیض کی زندگی کا یہ بہت بڑا حادثہ تھا جو کچھ انہوں نے نثر میں لکھا اس کو ہم نے پیش کر دیا لیکن بات یہاں ختم نہیں ہو جاتی۔ ان کی نظم ''یاس'' ''اسی کیفیت کی یادگار ہے۔'' اس نظم کے کچھ اشعار:

بربطِ دل کے تار ٹوٹ گئے
ہیں زمیں بوس راحتوں کے محل
بجھ گئی شمعِ آرزوئے جمیل
یاد باقی ہے بے کسی کی دلیل
انتظارِ فضول رہنے دے
رازِ الفت نبھانے والے
بارِ غم سے کراہنے والے
کاوشِ بے حصول رہنے دے

عالمی کساد بازاری (مہامندی) کے اختتام کے ساتھ 1935 میں فیض کو امرتسر کے ایم اے او کالج میں بطور لیکچرر داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ لاہور میں ایک طالب علم کے شکل میں انہوں نے

اپنی پہچان بنائی اور ان کی شاعری نے اسی شہر میں انگڑائی۔ لیکن امرتسر میں ان کا رہنا، پڑھنا اور نئے دوستوں کے ساتھ ہم کلام ہونا ان کی زندگی کا ایک نیا احساس تھا۔ فیض دن بہ دن نکھرتے چلے گئے، ان کی سمجھ ایک نئے راستے پر چل دی اور ان کی شاعری مایوسی کا دامن چھوڑ کر جدوجہد کی لے بنتی چلی گئی۔ امرتسر میں گزارے دنوں کے بارے میں فیض اپنے احساس و تجربہ کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

''امرتسر ہی میں پہلی بار سیاست میں تھوڑی بہت بصیرت اپنے کچھ رفقاء کی وجہ سے پیدا ہوئی جن میں محمود ظفر تھے، ڈاکٹر رشید جہاں تھیں، بعد میں ڈاکٹر تاثیر آ گئے تھے۔ یہ ایک نئی دنیا ثابت ہوئی۔ مزدوروں میں کام شروع کیا، سول لبرٹیز (شہری آزادی) کی ایک انجمن بنی تو اس میں کام کیا، ان سب سے ذہنی تسکین شروع ہوئی تو اس کی تنظیم میں کام کیا۔ ان سب سے ذہنی تسکین کا ایک بالکل نیا میدان ہاتھ آیا۔''

دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب فیض کے شعور نے انگڑائی لی تو ایسا لگا کہ ڈوبتی ہوئی سوئی سرخ پرچم لے کر کھڑی ہو گئی اور گنگنانے لگی:

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

فیض کی شاعری اردو ادب میں اس وقت اُجاگر ہوئی جب وہ ایک زبان کے طور پر اپنے عہدِ شباب میں قدم رکھ چکی تھی۔ یہ جوانی کا دور ہوتا بہت ظالم ہے، بھٹکا کر کہیں سے کہیں لے جاتا ہے مگر اس موڑ پر کھڑی اردو کو ترقی پسند تحریک نے ایک نئی سمت دی۔ اور اس تحریک میں فیض اگلی صف میں نظر آتے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے حُسن و عشق پر نثار ہونے والے ان کے اشعار نے ایک نئی شکل اختیار کر لی۔ رومانیت کی شبداولی تو چلمن سے لگی اپنے دیدار کراتی رہی لیکن الفاظ کے معانی کا مفہوم بدل گیا، غمِ جاناں بنیادی طور سے اب غمِ دہر میں تبدیل ہو گیا۔

حقیقت میں یہ دور ہی ایسا تھا، نئے نئے خیالات پھوٹ رہے تھے اور ان سب کو پریرنا (حوصلہ) دے رہے تھے جن کی طرف ادیبوں نے دیکھا نہیں تھا اور اگر کبھی دیکھا بھی تو وہ ایک

اچٹتی ہوئی نظر سے۔ فیض جیسے بھاوک (جذباتی) اور سنویدن شیل (حساس) شخص کے لیے حقیقی دنیا سے فرار ناممکن تھا۔ ایک بار جب اس تحریک کا حصہ بنے تو نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ خود ایک نئے راستے پر، ایک نئے ادب کی تواریخ کو بنانے والے بن گئے، ہر عظیم آدمی کے طرح وہ تاریخ کی دین بھی تھے اور اس کے بنانے والے بھی۔ لیکن جس بلندی پر فیض پہنچ گئے تھے وہاں آنے کے بعد بھی وہ ایک بھلے انسان ہی بنے رہے۔

فیض اور ان کے کچھ ہمنوا

ہمارے ادیبوں، خاص طور پر شاعروں میں یہ کمزوری دیکھنے کو ملتی ہے کہ وہ صرف اپنی بات سنانا یا اپنے بارے میں سننا پسند کرتے ہیں لیکن فیض نے ایک الگ مزاج پایا۔ انہوں نے اپنے بارے میں بہت ہی کم لکھا یا کہا اور وہ بھی اس لیے جب ان کے دوست ان کی گردن پر سوار ہو گئے۔ لیکن ان کا قلم پھوٹ پڑتا ہے جب ان کے ہمنوا، ہمسفر اور درد کو بانٹنے والے جیون کے سفر میں ان کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔

فیض کے ساتھیوں میں کچھ ایسے تھے جنہوں نے خود اس دور میں اپنی جگہ بنائی اور کچھ ایسے تھے جن کی خوبی اور سادہ لوحی سے کچھ ہی لوگ واقف تھے لیکن فیض نے ان سب کو چاہا، رسم نبھانے کے لیے نہیں، بلکہ دل کی گہرائیوں سے اور جب ان میں سے کوئی اٹھ گیا تو ایسا لگنے لگتا تھا کہ وہ بھی اس دنیا میں نہیں رہے، شدت کے ساتھ ان کے چہرے پر اداسی چھا جاتی تھی۔

سجاد ظہیر بیسویں صدی کی سیاست میں ایک جانا پہچانا نام تھا اور اردو ادب کو ایک تحریک کی شکل دینے میں ان کا بڑا کارنامہ رہا۔ وہ فیض کے ساتھ جیل میں بھی رہے اور رہائی کے بعد بھی ان کا رشتہ سلامت رہا، جب سجاد ظہیر پاکستان سے بھارت آ گئے تب بھی فیض سے ان کا لگاؤ قائم رہا اور فیض بھی جب ہندوستان آتے تو گھنٹوں ان کے ساتھ گزارتے۔ 1973 میں دل والے بنّے بھائی (سجاد ظہیر) اپنے دل کو سنبھال نہیں پائے اور اس دنیا سے چل بسے۔ فیض پر ان کے اچانک چلے جانے پر کیا گزری اس نے ایک یادگار نظم 'سجاد ظہیر کے نام' کی شکل اختیار کر لی۔

اس نظم کی ہر سطر کی اپنی لے ہے، اپنی آواز ہے اور وہ سب کچھ ہے جو اس موقع پر فیض کہنا چاہتے تھے۔ تکنیکی نظر سے پرکھنے پر یہ نظم اردو ادب میں ایک خاص جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہے۔
یہاں اس کے دو اشعار دینا مناسب ہوگا اور ایک مصرعہ بھی:

نہ اب ہم ساتھ سیرِ گل کریں گے
نہ اب مل کر سرِ مقتل چلیں گے

نہ غمہائے وطن پر اشکباری
سُنیں گے نغمۂ زنجیر مل کر

بہ یادِ کلفتِ ایامِ زنداں
(قید خانے میں مصیبت بھرے دنوں کی یاد)

اور جب یہ نظم اپنی آخری سطور میں پہنچ جاتی ہے تو فیض کا چھپا ہوا درد مچل کر پھوٹ پڑتا ہے:

بڑھا دو شمعِ محفل بزم والو
پیئو اب ایک جامِ الوداعی
پیئو اور پی کے ساغر توڑ ڈالو

دل سے نکلے ہوئے ان جذبات کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو عقل کے کٹھ ملا نہیں ہیں۔
ایک طرف جہاں سجاد ظہیر کی موت نے فیض کو ایک گہرا گھاؤ دیا وہاں وہ ترقی پسند تحریک کے ایک ہر دل عزیز شاعر مخدوم (1969-1908) کی جدائی سے از حد افسردہ ہو گئے۔ اس بے وقت کنارا کشی نے فیض کو 'دو غزلیں' مخدوم کی یاد میں لکھنے پر مجبور کر دیا، 'پہلی' غزل کی پہلی سطر مخدوم کی ہی ہے:

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر

چاندنی دل دکھاتی رہی رات بھر
گاہ جلتی ہوئی گاہ بجھتی ہوئی
شمعِ غم جھلملاتی رہی رات بھر

اور اس 'پہلی' غزل کے اس شعر پر غور کیجیے:

جو نہ آیا اسے کوئی زنجیرِ در
ہر صدا پر بلاتی رہی رات بھر

مخدوم کی دوسری مشہور نظم 'اسی انداز سے چلے بادِ صبا آخرِ شب' فیض کی 'دوسری' غزل کی پہلی سطر بنی۔ اس غزل کا دوسرا شعر بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔

صبح پھوٹی تو وہ پہلو سے اٹھا آخر شب
وہ جو اک عمر سے آیا نہ گیا آخر شب

فیض اس وقت ماسکو میں تھے جب انہوں نے 'دو غزلیں' لکھیں، مخدوم کی یاد ان کو ستاتی رہی اور انہوں نے 'ایک دکنی غزل' دکن کی شیلی (طرزِ اسلوب) میں لکھ ڈالی، اس کے پہلے شعر کو پڑھیں اور سر دُھن لیں۔

کچھ پہلے ان آنکھوں آگے کیا کیا نہ نظارہ گزرے تھا
کیا روشن ہو جاتی تھی گلی جب یار ہمارا گزرے تھا

فیض کا یہ یار بھی جمہوری تحریک کا ایک بانکا سپاہی تھا، مزدوروں کے بیچ میں پہنچا تو اُن کا پرچم اٹھا لیا اور جب تلنگانا کے بہادر کسانوں نے کرانتی (انقلاب) کا بگل بجایا تو مخدوم ان کے بیچ میں کھڑا تھا۔ فیض ذاتی طور پر مخدوم کے قریب نہیں رہے لیکن ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کے حوصلے کے مدّاح تھے۔

فیض کی قلم چند مشہور شاعروں پر ہی نہیں رُک جاتی، وہ ایک ویاپک (شفاف) دل رکھتے تھے اور ان ساتھیوں کی بہت عزّت کرتے تھے جو ان کے برے دنوں کے ساتھی رہے۔ یہی سبب ہے کہ

جیل میں، قیدی کی شکل میں، ان کے ساتھ رہے میجر اسحاق کی موت کی خبر جب انہیں ملی تو وہ تڑپ کے رہ گئے اور اس دکھ کا اظہار اپنی نظم 'میجر اسحاق کی یاد میں' میں اس طرح کرتے ہیں:

لو تم بھی گئے ہم نے تو سمجھا تھا کہ تم نے
باندھا تھا کوئی یاروں سے پیمانِ وفا اور

اور پھر اس شعر کی گہرائی پر بھی غور کریں:

ہر خار رہِ دشتِ وطن کا ہے سوالی
کب دیکھیے آتا ہے کوئی آبلہ پا اور

بار بار فیض کے ساتھیوں نے اپنی اچانک موت سے ان کے زخموں کو ہرا کیا۔ ڈاکٹر رشید جہاں ہوں یا سعادت حسن منٹو ان کو دونوں عزیز تھے۔ فیض نے اُن کے گزرنے کے بعد جو لکھا وہ نثر میں ہے۔ اپنی شریک حیات ایلس کے نام اپنے خط (9 اگست 1952) میں ڈاکٹر رشید جہاں کی اس دنیا سے کوچ کرنے کی خبر سُننے پر فیض پر کیا گزری وہ خود اس کا اظہار کرتے ہیں:

''اس کے جانے سے ہمارے برِّصغیر سے نیکی اور انسان دوستی کی بہت بڑی دولت چھن گئی۔'' (تفصیل کے لیے دیکھیے نیا پتھ، اکتوبر۔ دسمبر 2010 فیض ولادتِ صد سالہ خاص نمبر 127-126)

فیض کو سعادت حسن منٹو (Manto) کے انتقال کی خبر سن کر بہت دکھ ہوا، اپنے خط (27 جنوری 1955) میں لکھتے ہیں:

''سب کمزوریوں کے باوجود وہ مجھے نہایت عزیز تھے اور اس بات پر مجھے فخر بھی ہے کہ وہ امرتسر میں میرے شاگرد تھے...... منٹو عظیم نہیں تھا لیکن بہت دیانتدار، بہت ہنرمند اور قطعی راست گو تھا۔'' (وہی، 127)

فیض کو ہم نے دیکھا بھی لیکن ان کی رَچناؤں کو پڑھنے کے بعد ہی معلوم ہوا کہ وہ کیا تھے اور آج جب ہم ان کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر انہیں یاد کرتے ہیں تو ایک نئی صبح اپنی کرنیں بکھیرتی ہوئی

نظر آتی ہے۔ پھر ان کی زندگی ہمیں سکھاتی ہے کہ ظلم کے خلاف جد و جہد ہر صورت میں جاری رکھو، آواز کو بلند رکھو چاہے یہ ڈاکٹر بنایک سین (ہندوستان کے سپریم کورٹ سے ڈاکٹر موصوف کو ضمانت پر رہائی ملنے سے پہلے یہ لیکھ یا مضمون لکھا تھا) کی رہائی کے لیے ہو یا دیگر ظلم و ستم کے شکار لوگوں کے لیے ہو۔ ہاں فیض کے ساتھ ان لوگوں کو بھی یاد رکھیں جو ان کے ہم سفر اور انسانی قدروں کے چمکتے ستارے تھے۔

فیض کا دور: کچھ اور روشن چراغ

اختر جمال، احسن علی خاں

ظہور صدیقی

ادبی دنیا میں فیض کے ہم عصر ایک دو نہیں کئی نامی گرامی ہستیاں تھیں۔ شاعری میں اقبال اپنی دھاک جمانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ پھر جوش اُبھرے اور نثر کے میدان میں پریم چند کا ایسا ڈنکا بجا جس کی مثال اس وقت تک نہ تو اردو اور نہ ہی ہندی ادب میں دیکھنے کو ملتی تھی اور جب ترقی پسند تحریک منظم ہو کر گامزن ہوئی تو اس نے ہر چلنے والے قلم کو، ہر سوچنے والے دماغ کو اور ہر جذبات سے لبریز دل کو ایسی ڈگر پر ڈال دیا، جو بھلے ہی کانٹوں سے بھری ہو، لیکن جس کا مقصد تابناک تھا۔ ہر کھائی کو پھاندتا ہوا، مذہبی تشدد کو دُھتکارتا ہوا، ذات کو چنوتی دیتا ہوا اور ہر طرح کے رنگ و نسل کے بھید بھاؤ کو روندتا ہوا جب یہ کارواں چلا تو اس سے مختلف ادیب و شاعر جڑتے چلے گئے۔ فیض کے ساتھ ساتھ جو چرچہ کا موضوع بنے ان میں مخدوم، ساحر، سردار جعفری، مجاز، کیفی اعظمی اور اختر الایمان کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے اور افسانے کی دنیا میں راجندر سنگھ بیدی نے ہر سنجیدہ قاری کا من موہ لیا۔ ہاں کرشن چندر اور منٹو بھی تھے اور 'آگ کا دریا' لکھ کر قرۃ العین حیدر نے ناول

نگاری کے میدان میں تہلکہ مچادیا، کچھ اور نام بھی ابھرے جیسے کہ وامق جونپوری، تاباں اور سلام مچھلی شہری۔ لیکن پھر بھی کچھ ایسے بھی تھے جو وہ مقام نہیں پاسکے جو اُن کو ملنا چاہیے تھا۔

اختر جمال

اختر جمال ان میں سے ایک ہیں۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھیں جنہوں نے ترقی پسند تحریک (پرگتی شیل آندولن) کو مقامی طور پر گرمانے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ بھوپال میں ایک تیز گامی کی شکل میں ابھریں اور جب لکھنا شروع کیا تو ان کے قلم نے، چاہے مضمون ہوں یا افسانے، انسانوں کے جذبات کی نہ صرف قدر کی بلکہ ان کے بیچ کے صحت مند رشتوں کی بہترین عکاسی کی۔ زندہ رہیں تو درد پاتی بھی رہیں لیکن اس کو نبھاتی بھی رہیں کیونکہ وہ سمجھتی تھیں کہ آنسو بہانے سے تھوڑی دیر کے لیے درد کا احساس کم تو ہو جاتا ہے لیکن آنسو درد کا علاج نہیں، اس کے لیے حوصلے اور بہادری کی ضرورت ہوتی ہے۔ جواں بیٹی تزئین، ان کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی اور جب طارق احسن نے ان کے پاس رہ کر ان کے دکھوں کا مداوا کرنا چاہا تو ضیاء الحق نے ان کے اس اکلوتے بیٹے کو جیل میں ڈال دیا کیونکہ وہ آمریت (تاناشاہی) کے خلاف تھا اور 'نظامِ مصطفیٰ' کے نام پر جمہوریت کا گلا گھونٹنا اس کو برداشت نہیں تھا۔ پھر ان کے ہم شریک احسن علی خاں بھی تزئین کے پاس پہنچ گئے۔ حالات ایسے ہوتے گئے کہ ان کو پاکستان چھوڑنا پڑا اور ان کا انتقال 9 فروری 2011 میں اُٹاوا (کناڈا) میں ہوا، کیا یہاں ظفر کا یہ شعر یاد نہیں آتا؟

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

ملک کی تقسیم (1947) کے بعد کچھ مہینوں تک اختر جمال پیر جمانے کے لیے جدوجہد کرتی رہیں۔ بھوپال میں جب کالج کے دروازے ان کے لیے بند ہو گئے تو علی گڑھ کا رُخ کیا اور وہاں کے ویمنس کالج (AMU) میں داخلہ لیا لیکن حالات ایسے ہوتے چلے گئے کہ انہوں نے اپنے شوہر احسن علی خاں کے ساتھ پاکستان کا رُخ کیا۔

شروع میں اختر جمال اور احسن علی خاں کو پاکستان میں بھی پاپڑ بیلنے پڑے لیکن پھر بھی ان دونوں کا قلم چلتا رہا۔ اختر جمال کے مضمون اور افسانے رسالوں میں چھپتے رہے اور ان کے اچھوتے انداز سے وہ اپنے قارئین کو راس آتی رہیں۔ شروع میں ان کی جو کتابیں چھپیں ان کے نام ہے۔

'انگلیاں دلفگار اپنی'؛ خلائی دور کی محبت، زرد پتوں کا بن، سمجھوتہ ایکسپریس اور 'ہری گھاس سرخ گلاب'

اختر جمال کی ادبی شعور (چیتنا) میں کہیں کہیں مذہب کی جھلک ایک ذاتی انداز میں تو ضرور ملتی ہے لیکن ان کی نظر کہیں بھی جنونی کیفیت کا شکار نہیں ہوتی۔ وہ انسانی قدروں کی نقیب تھیں اور پاکستان جانے کے بعد بھی نہ تو تنگ نظری ان کے ذہن پر حاوی ہو پائی اور نہ ملائیت خاص طور پر ضیاء الحق برانڈ ملائیت، جس میں نہ تو روشنی (ضیا) تھی اور نہ ہی سچائی (حق)۔ اگر تھا تو چھل، کپٹ، یا تنائیں اور امریکی سرکار کی جے جے۔ مذہب کے نام پر بار بار بھولے انسانوں کو ٹھگا گیا لیکن 'نظامِ مصطفیٰ' کے نام پر جس طرح اسلام کو ذلیل کیا گیا اس کی تاریخ میں دوسری مثال ملنا مشکل ہے۔

اختر جمال نے ایک غائرانہ (پینی) نظر پائی تھی اور بھلے ہی وہ کہیں کہیں جذبات میں ڈوبی ہوئی ملیں لیکن بات بہت پتے کی کہہ جاتی تھیں۔ 'شاخِ گل' میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ اقبال سے اپنی پلہ جھاڑنے کے بعد وہ فیض کو غالب کا اوتار بنا بیٹھیں۔

''فیض صاحب کے گھر جاتے ہوئے مجھے غالب کی ہی یاد آتی رہی۔ شیخ عبدالقادر نے لکھا تھا کہ غالب نے اردو شاعری سے شدید محبت کی وجہ سے اقبال کے جسم میں دوسرا جنم لیا۔ مگر مجھے یوں لگتا ہے کہ غالباً اس 'مردِ مومن' کے جسم میں وہ زیادہ دنوں تک نہ رہ سکے کیونکہ وہ تو سب مئتوں کو ختم کر کے 'اعضائے ایمان' (ایمان کا حصہ) بنا چکے تھے۔ سُنا ہے کہ عالمِ ارواح سے روحیں پرندوں کی صورت میں آتی ہیں، جب غالب کو اقبال سے 'شاہین' بنانا چاہا تو وہ گھبرا کر 'کنجشک فرومایا' کی صورت میں نکل بھاگے اور اس جگہ سیالکوٹ (پنجاب کا ضلع جہاں کالا قدر گاؤں میں فیض پیدا ہوئے تھے) میں ایک نوعمر طالب علم فیض احمد فیض کو سڑک پر سے گزرتے دیکھ کر اس کے ساتھ ہو لئے۔ ان کے وجود کو محسوس کر کے فیض احمد نے اپنے نام کے آگے فیض اور لگالیا۔''

''مجھے اقبال اور غالب میں اتنی قربت محسوس نہیں ہوتی جتنی قربت غالب اور فیض میں۔''

اختر جمال کو غالب سے دلی لگاؤ تھا اور اس پیار کی پاکیزگی اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ وہ دیوان غالب کو وضو کرنے کے بعد ہی ہاتھ میں لیتی تھیں۔ ایک بار اس عقیدت کو دیکھ کر ان کے شوہر احسن علی خاں نے کہا:

''تو تم دیوانِ غالب وضو کر کے پڑھتی ہو اس شخص نے تو ساری زندگی نماز بھی نہیں پڑھی تھی۔''

آگے اس بات پر اختر جمال کی عبارت دیکھئے:

''اب یہ کیسے سمجھائیں کہ اس شخص نے تو ساری زندگی فن کو عبادت بنالیا تھا۔ اسے نماز کے تعلق کی کیا ضرورت تھی۔ لفظ و معانی کا رشتہ جو سمجھایا ہے!''

اختر جمال یوں تو فیض کو 'ہمارے ادب کی سب سے بڑی امانت' ضرور سمجھتی ہیں لیکن 'شاخ گل' میں ایلس یعنی مسز فیض پر جو انہوں نے لکھا ہے وہ ایک اچھی سمجھ اور نیک دلی کا ایک اچھوتا نمونہ ہے۔

''مسز فیض کے ڈرائنگ روم میں قدم رکھ کر پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہیں پاکستانی ثقافت سے کتنی دلچسپی ہے۔ ہر چیز میں سادگی حسن اور سلیقہ نظر آتا ہے۔''

حالانکہ اختر جمال اپنے دونوں بچوں، طارق احسن و تزئین اور اپنے شوہر احسن علی خاں کے ساتھ فیض و ایلس کی 31 ویں شادی کی سالگرہ پر ان کے گھر پہنچی تھیں۔ لیکن انہوں نے پایا کہ یہاں ماحول کچھ الگ ہی سا تھا کیونکہ ایلس کی باتوں کا مرکز پاکستان کا کلچر تھا جس کی وہ حفاظت کرنا بہت ضروری سمجھتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس بات نے اختر جمال پر فوراً اثر ڈالا۔

اختر جمال نے لکھا:

''مسز فیض کی باتوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ ہمارے ہاں پڑھی لکھی عورتوں میں سے بیشتر کپڑوں اور زیوروں کی بات کرتی ہیں اور جب میں پڑھی لکھی عورتوں کا ان موضوعات پر بولتی دیکھتی ہوں تو میری یہ آرزو ہوتی ہے کہ انہیں یہ سزا دی جائے کہ ان کی ڈگریاں ضبط کر لی جائیں۔''

فیض کا دور بہت اذیت ناک بھی تھا اور صحت مند بھی۔ اختر جمال کی رچناؤں کی خوبی یہ ہے کہ

انہوں نے بار بار قارئین کو یقین دلایا ہے کہ وہ ایک بڑا دل رکھتی ہیں اور ان کی 'راکھی' کو پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ اگر انسان ایک دوسرے کو، ان کی تہذیب کو، عزت اور احترام دے اور اپنے رشتوں کی بنیاد پیار کو بنائے تو یہ دنیا کتنی حسین بن سکتی ہے۔ جب ان کی پہلی ریشم کی لال راکھی لے کر آئی تو اختر جمال نے اپنے جذبات کو ان الفاظ میں پیش کیا:

''وہ سرخ دھاگے مجھے دنیا کی سب سے مقدس چیز معلوم ہوئے قرآن شریف کے اوراق کی طرح خوبصورت اور مقدس۔''

یہ راکھی کرشن چندر کے لئے تھی: اپنی کہانی 'راکھی' کو وہ ان الفاظ کے ساتھ شروع کرتی ہے:

''کہانی کے رشتے سے اور ترقی پسند تحریک کے رشتے سے تو کرشن جی میرے بڑے بھائی تھے۔ مگر جب میں نے انہیں سرخ ریشم کی راکھی بھیجی تو پھر یہ روحانی رشتہ حقیقی رشتہ بن گیا۔ سرخ راکھی میں نے اس لیے چُنی تھی کہ وہ اس تحریک کا رنگ تھا اور خون کا بھی۔''

ہاں یہاں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ اختر جمال کا یہ رشتہ اور پکا ہوتا گیا۔ جہاں کرشن چندر اپنی چھوٹی بہن کا بے حد خیال رکھتے تھے وہاں ان کی یہ بہن ان کو مہان کردار کے روپ میں دیکھتی تھی اور جب دِلّی کی جامع مسجد کے پاس کرشن چندر نے ان کو اتارا تو وہ یہ سوچنے پر مجبور تھیں: ''میری نظر جامع مسجد کے خوبصورت اور عظیم ستونوں پر پڑی اور میں نے سوچا کہ کرشن جی بھی ایسے ہی بلند اور عظیم ہیں۔''

21 سال کے بعد 1969 میں جب اختر جمال بمبئی پہنچیں تو انہیں ''احساس ہوا کہ انہیں تقسیم بھی تقسیم نہ کر سکی ہے۔ ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سن کر میں سوچنے لگی کہ ادب کے لیے نہ کوئی حد (سیما) اور نہ مقام، نہ وقت۔ ادب تو ازل سے ابد تک لامتناہی سمندر ہے۔''

ان کی کہانی راکھی کے اہم الفاظ ہیں:

''دیوالی کی روشنی نے میرے دل میں امید کا دِیا روشن کر دیا۔ میں نے سوچا ہماری سرحدیں ایک دن محبت کی سرحدیں بن جائیں گی۔ دیوالی کی روشنیوں نے اس رات کا اندھیرا ختم کر دیا تھا۔''

احسن علی خان

ایک طرف جہاں اختر جمال حقیقت نگاری کا پرچم اٹھائے ہوئے تھیں وہاں ان کے ہم شریک احسن علی خاں تانا شاہی کے خلاف اپنے شعروں سے لگاتار مزاحمت کا اظہار کرتے رہے تھے۔ ان کا پہلا اشعار کا مجموعہ تھا 'میں محسوس کرتا ہوں، میں سوچتا ہوں'۔ 6 اکتوبر 1977 میں فیض احمد فیض نے اس کا تعارف لکھتے ہوئے کہا تھا:

''احسن علی خاں نے الگ طرزِ بیاں اختیار کی ہے جس میں غزل کا احساس نہیں ہے۔ تشبیہ و استعارہ کے بیل بوٹے نہیں ہیں لیکن ان آرائشوں کے بغیر بھی اچھی شاعری کے سبھی تلازمے موجود ہیں، سوچ، احساس، سلاست اور سلاستِ اظہار، موزونی و آہنگ اور کفایتِ الفاظ۔'' فیض نے آگے لکھا ہے: ''ان کی سوچ میں احساس کی گرمی اور احساس میں سوچ کی خنک انتہائی موثر ہے۔''

احسن علی خاں کی کویتاؤں کا دوسرا سنگرہ (مجموعہ) 'شعلۂ جاں' 1991 میں چھپ کر سامنے آیا۔ جس کو انہوں نے اس طرح معنون (سمرپت) کیا ہے:

''آمریت (تانا شاہی) کے خلاف لڑنے کے نام۔''

انہوں نے جو بھی لکھا ہے وہ سستی نعرے بازی نہیں بلکہ ایک سنجیدہ زبان کی روشن عکاسی ہے۔ جو فوجی نظام پاکستان میں بار بار قائم ہوا وہ فیض کی طرح احسن کو بھی قبول نہیں تھا۔ اس کے مختلف پہلوؤں کو اور روپوں (جہتوں) کو انہوں نے پوری طرح سے بے نقاب کیا۔

دسمبر 1977 میں ان کے ذریعہ لکھی گئی نظم 'بیورو کریسی' ایک انوکھی مثال ہے۔ اس کا پہلا بند اس طرح ہے:

ایک
اہرام
اونچا اور تکونہ
اس کی سیڑھیاں بے گنتی
ہر سیڑھی سے بدعنوانی کی بو آئے

اس کے اندر فرعونوں کی سڑتی گلتی لاشیں ہیں
اس کے باہر زہر تھا فن پینے والے بے بس بیمار انساں ہیں

اسی خیال کو چھوٹی سی نظم 'سوچ کی سزا' میں اس طرح پیش کرتے ہیں:

میری روزی کو میری سوچ نے خطرے میں ڈالا ہے
کہا تھا میں نے افسر سے 'اگر یوں ہو تو بہتر ہو'
میرے افسر کو غصہ آ گیا اور اس نے فرمایا
''ذرا اس کی خبر لینا کہ یہ بھی سوچتا ہے''

(4 ستمبر 1978)

احسن کا 'شاعر'، 'حرفِ حق' کا مظہر ہے اور وہ اس ضمن میں پنجاب کے مشہور صوفی شاعر بھلے شاہ کو یاد کرنا نہیں بھولتے جنہوں نے سچائی اور مساوات کے گیت گائے:

ربّا دنیا میں پھر بُھلّے شاہ کو پیدا کر دے
تیری بات کو رد کر کے جو سب کی جھولی بھر دے

انہوں نے 47-1946 کے فسادات کی اذیتوں کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا۔ ان کی نظم 'صبحِ آزادی' بھلے ہی فیض کے اس موقع پر لکھی گئی 'شب گزیدہ سحر' کے موازنہ میں اتنی مہان رچنا کا درجہ نہیں پا سکی لیکن اس کی پُر درد تشریح ضرور ہے:

کتنے نوجواں بیٹے
خون میں نہائے ہیں
کتنی ماؤں نے آنسو
رات دن بہائے ہیں
کتنی کلیاں عصمت کی

ظالموں نے مَسلی ہیں

کتنے گھر ہوئے ویراں

کتنی بستیاں اجڑیں

پھر کہاں کہاں ہو کر

خار خار راہوں سے

ہم لہو لہو گزرے

فیض کے آفاقی نظریے سے متاثر احسن کی اعلیٰ تخلیق اپنی انتہائی سادہ طرزِ بیان کے باوجود شاہکار بن جاتی ہے:

دائرہ

تنگ ہوتا گیا

میں سمٹتا گیا

اتنا سمٹا کہ ایٹم بنا

اور پھر

ایک تضادِ مسلسل سے

اس طرح پُھوٹا

کہ صورِ قیامت بنا

ہیروشیما بنا

ناگاساکی بنا

احسن کی دو لمبی نظمیں 'تزئین سے' اور 'تزینِ غم' اپنی بیٹی کے وفات پر المیہ گیت ہیں جو مشہور ہندی کوی نرالا کی 'سروج اسمرتی' کی یاد تازہ کر جاتی ہیں۔

ضیاء الحق کے 'نظامِ مصطفیٰ' کے دور میں وحشی کتوں کا راج تھا اور اُن کی حرکتوں کو بیان کرتے

ہوئے انہوں نے دو کویتائیں 'دو کتے' لکھیں۔ ان میں سے پہلی نظم (کویتا) یہ ہے:

یہ کتے

زبان نکالے ہوئے

رال منہ سے بہاتے ہوئے

شہر میں جا بجا گھومتے ہیں

خطا کار سے درگزر کر رہے ہیں

جو معصوم ہیں ان کے پیچھے پڑے ہیں

یہی ایک صورت ہے پیچھا چھڑانے کی ان سے

کرنسی کی کچھ ہڈیاں ڈالوان کے آگے

فوجی حکومت کی ان یاتناؤں (اذیتوں) کے سامنے احسن اپنے محبوب شاعر فیض کی طرح چوٹ کھاتے رہے۔ لیکن ان کا ضمیر زندہ رہا وہ مرے نہیں:

جس دن

تم

زنجیروں میں جکڑے

مظلوموں کے سامنے آؤ گے

اور یہ دیکھ کے حیراں ہوں گے

تم نے مجھ کو قید کیا تھا، قتل کیا تھا

لیکن

زندہ اور آزاد ہوں میں

احسن جو بھی برداشت کرتے رہے زندگی کبھی ان کے لیے مردہ لاش نہیں بنی، وہ چلتے رہے اور پیار کرتے رہے:

پھر بھی میں
چاہنا ختم کرتا نہیں
سوچنا بند کرتا نہیں
کیونکہ
اے زندگی! مجھ کو تم سے بہت پیار ہے (زندگی، 30 اپریل 1983)

لکھنے کو تو اور بہت کچھ ہے۔ فیض کا دور ہی ایسا تھا جہاں ظلموں سے ٹکراتے ہوئے مختلف جانباز پیدا ہوئے اور وہ وہی تھے جو اپنے لیے نہیں جئے بلکہ ہر انسان کے درد کو اپنا درد سمجھا۔

فیض نے جن لوگوں کو پریرنا (inspiration) دی، حوصلہ دیا اور نیکی کے راستے پر مضبوطی سے چلنا ان کا مقصد بنایا احسن علی خاں ان میں سے ایک تھے۔ جب فیض 1984 میں اس دنیا سے چل بسے اور ہزاروں دل بے قرار ہو گئے۔ ان کے دور کا ایک عظیم شخص اور ادیب اٹھ گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہر طرف سے ان کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ احسن علی خاں بھی خاموش کیسے رہتے! اپنے جذبات کی رونمائی انہوں نے اس طرح کی:

جواں افکار کا شاعر
حسیں تخیل کا شاعر
گھرے احساس کا شاعر
نئے اسلوب کا شاعر
بہت آئیں گے لیکن کوئی اس جیسا نہیں ہوگا (فیض احمد فیض 1984)

اخیر میں فیض کو یاد کرتے ہوئے ہم انہیں ان الفاظ کے ساتھ اور ان کے ہمنواؤں کو سلام کرتے ہیں:

''ادب اور فن کے آئینے میں ہی انسان اپنے آپ کو پہچانتا ہے، زندگی اپنا چہرہ دیکھتی ہے، تاریخ اپنا سفر طے کرتی ہے، ہمارے پیشرو ادیب ہمیں اتنا دے جاتے ہیں کہ ان کا ہم پر اتنا قرض ہوتا ہے مگر افسوس ہم انہیں کچھ نہیں دے سکتے۔ ہم صرف انہیں یاد کر سکتے ہیں۔ وہ ہمیں بیکراں روشنی دیتے ہیں، راہ کی ساری تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں، سب چیزوں کے مطلب اور معانی سمجھ میں آتے ہیں۔ ان کے پیچھے چپ چاپ چلتی رہتی ہیں ننھی ننھی سی چنگاری اپنے وجود کو خاک میں چھپائے اس کوشش میں کہ شاید کبھی اس چنگاری سے کوئی شعلہ پیدا کر سکیں۔''

(اختر جمال۔ 'ہری گھاس، سرخ گلاب' میں شامل آئینہ عنوان مضمون سے)

شاعری ہے کہ پیغام ہے

ظہور صدیقی

فیض کی شاعری نے اپنی پہچان اس لیے بنائی کیونکہ ان میں دور دور تک بناوٹ نہیں تھی، جو دل پر گزری اس کو 'رقم' کردیا۔ ہاں یہ بھی ٹھیک ہے کہ ان کی عقل نے انہیں شاید کبھی 'تنہا' نہیں چھوڑا اور اسی وجہ سے ان کی شاعری سوچ اور غور وفکر کی ایک دلنواز لے بن جاتی ہے۔

یہ درست ہے کہ انہوں نے کم لکھا، ہم کہتے ہیں جتنا انہوں نے لکھا اس کو پہلے سمجھ تو لیں اور اگر سمجھ میں آجائے تو پھر اپنے قدموں کو آگے بڑھائیں، کچھ کر بیٹھیں۔ جہاں تک ہماری بات ہے جب بھی ان کے کلام پر ہم نے نظر ڈالی تو ایسا لگا کہ اس شعر کو یا اس شعر کو اپنے دل میں ہم وہ جگہ نہیں دے پائے جس کا وہ مستحق تھا۔ کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں کہ کوئی شاعر فیض جیسا یا اس سے بلند تر ہو بھی پائے گا؟ سوال مشکل ہے!

ہمارا خیال ہے کہ اگر فیض کچھ نہیں لکھتے، صرف 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے' کی تخلیق کر جاتے تو ادب کی دنیا میں زندہ رکھنے کے لیے کافی تھا۔ ہمیں یہ نظم بہت پسند ہے اور بعد میں معلوم ہوا کہ فیض بھی اس کو اپنی سب سے محبوب تصنیف مانتے تھے۔

کیا کسی کو گمان ہوگا کہ جو نظم 'ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت' سے شروع ہو، جہاں 'ہونٹوں کی لالی لپکتی' ہو اور زلفوں سے 'مستی برس' رہی ہو لاکھوں دلوں کو ہلانے والی آواز بن جائے گی۔ ایک نظم

پیچھے کی طرف گھما کر پھر سامنے دیکھیں تو ایسا لگتا ہے کہ حُسن کالی داس کی شکنتلا بن کر صدیوں کا سفر طے کر کے ان کے شعروں میں نمایاں ہو گیا ہے اور کیا ہونٹوں کی لالی کو دیکھ کر بمب کا سرخ پھل یاد نہیں آجاتا ہے؟ لیکن اتنی حسین اور شیریں زبان کا استعمال اس نصب العین کے لئے کرتے ہیں جو ان کو عزیز تر ہے:

دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم

آخری سانس تک، جامِ شہادت پیتے ہوئے اس جانباز روزن برگ جوڑے نے کیسا حوصلہ و عزم دکھایا! بیشک خواہشات اور تمنائیں امڈتی ہیں، دل کو تھامنا پڑ جاتا ہے جب ہم ان شعروں کو یاد کرتے ہیں:

نا رسائی اگر اپنی تقدیر تھی
تیری اُلفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے

یہ 'روزن برگ' جوڑا 'اپنی الفت' پر نازاں ہے، 'شرمسار نہیں'۔ بھلے ہی اس راہ نے انہیں قتل گاہ تک پہنچا دیا لیکن اتھل وجیولیس روزن برگ نے مہما (عظمت) اور مریادا (نیک چلنی) کی جیالی مثال قائم کی۔

'دل میں قندیلِ غم' ہونا فطری ہے۔ کیونکہ دل پھر دل ہے 'سنگ وخشت' نہیں لیکن فیض کی شاعری کی سب سے تابناک خوبی یہ ہے کہ وہ ہر قدم پر حوصلہ دیتی ہے اور اسی لیے گرے ہوئے پرچموں کو لے کر جیالے عاشقوں کے قافلے نکل پڑتے ہیں۔

یہ دردناک حادثہ محدود دائرے میں سمٹ کر نہیں رہ جاتا بلکہ چہار جانب اس کی گونج جاتی ہے۔ درد کے فاصلے ایک حد تک کم ہوتے چلے جاتے ہیں: یہ درد سب کا درد بن جاتا ہے۔ سامراجی حکمرانوں کا تشدد آمیز چہرہ بے نقاب ہو جاتا ہے۔ دراصل 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'

فیض کا کمیونسٹ مینی فیسٹو بن گیا ہے۔

فیض نے کئی ایسی رچنائیں پیش کی ہیں جو اپنی گہرائی اور غور و خوض کے سبب دنیا کے ہر عوامی شاعر کو ان کے سامنے اپنا سر جھکانے پر مجبور کر دیتی ہیں اور نقاد کتنا بھی سنگدل ہو جب وہ ان کے شعروں کو سنجیدگی سے پڑھتا ہے تو وہ بھی فیض کی صناعی کا قائل ہو جاتا ہے۔

حقیقت میں فیض کا زمانہ کچھ ایسا تھا جہاں ایک طرف ظلم کا لاوا پھوٹ رہا تھا تو دوسرے جانب سرخ کرنیں ابھر آئی تھیں، ایک طرف درد کی چیخ تھی تو دوسری جانب اس کا مداوا بھی تھا۔ فیض نے درد کو بھی چوم لیا اور اس کے علاج کو بھی۔

بازی ہے بہت سخت درمیاں حق و باطل
وہ ظلم میں کامل ہیں تو ہم صبر میں کامل
بازی ہوئی انجام، مبارک ہو عزیزو
باطل ہوا ناکام، مبارک ہو عزیزو

فیض اس مرثیہ میں رُلاتے نہیں بلکہ جگاتے ہیں۔ فیض کی شاعری میں مشاہدہ تو ہے ہی ساتھ ہی ساتھ ایک انوکھا انداز بھی ہے۔ 'گلوں میں رنگ' بھرتے ہوئے 'سوئے دار' تک پہنچ جاتے ہیں۔ رومانیت کو کبھی مقصد پر حاوی نہیں ہونے دیتے۔

اگست کے مہینے میں ان کی لکھی ہوئی 'یومِ آزادی' (14 اگست 1947) کے موضوع پر لکھی گئی نظموں کا جائزہ بھی لیجئے: آزادی کا وہ دن ان کے لیے مایوس کن تھا:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

اگست 1952 میں کچھ حالات بہتر لگے تو کہہ بیٹھے:

اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں
گوشے رہِ چمن میں غزل خواں ہوئے تو ہیں

ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

لیکن پھر اگست 1955 کے دور میں انہیں یہ کہنے میں دیر نہیں لگی:

چاند دیکھا تیری آنکھوں میں، نہ ہونٹوں پہ شفق
ملتی جلتی ہے شبِ غم سے تیری دید اب کے

آزادی کے اس دن پر لکھی ہوئی فیض کی 14 اگست 1967 کی نظم جس کا عنوان 'دعا' ہے، اپنے سبک انداز لیکن پر معنی پیغام کے لیے ان کی ممتاز تخلیقات میں شمار کی جاتی ہیں۔ چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنہیں رسمِ دعا یاد نہیں
ہم جنہیں سوزِ محبت کے سوا
کوئی بت، کوئی خدا یاد نہیں

....

جن کی آنکھوں کو رُخِ صبح کا یارا بھی نہیں
ان کی راتوں میں کوئی شمع منور کر دے

فیض کو اپنے وطن سے بے پناہ محبت تھی اور اسی لیے 'رُخِ سحر کی لگن' ان کے قدموں کو آگے بڑھنے کے لیے اُکساتی رہی: 'چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی' لیکن فیض دوسرے ممالک کے لوگوں کو نیچا دکھانے کو وطن پرستی نہیں سمجھتے تھے۔ چاہے کرسی پر بیٹھے ہوئے لوگ کچھ بھی تماشے دکھاتے رہے ان کا ہندوستان آنا نہیں رُکا اور جب بھی وہ آئے لوگ سیکڑوں و ہزاروں کی تعداد میں ان سے ملنے، انہیں سننے پہنچ جاتے تھے۔ 60-1959 کے دوران ان کا جب دلی آنا ہوا تو وہ ڈاکٹر کے ایم اشرف سے ملنے کروڑی مل کالج آئے۔ ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کالج والوں نے ان کو سننے کے لیے

ہال میں میٹنگ کا انتظام کرلیا تھا۔ وقت سے پہلے ہی ہال کھچا کھچ بھر گیا تھا لیکن جب وقت زیادہ ہو گیا تو ڈاکٹر* کنور محمد اشرف ہال سے باہر آ کر کھڑے ہو گئے، ان کے پیچھے ان کے شاگرد ارجن دیو اور ہربنس مکھیا بھی چلے آئے اور اس انتظار کی گھڑی میں ہم نے بھی ان سب کا ساتھ دیا۔

خدا خدا کر کے فیض کی شکل نظر آئی اور وہ آتے ہی ڈاکٹر اشرف کے جملے کا شکار ہوئے: 'ہم نے تو اپنے معشوق کا بھی کبھی اتنا انتظار نہیں کیا۔' فیض کچھ جھینپ سے گئے اور ڈاکٹر اشرف سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولے: 'بنے بھائی (سجاد ظہیر) اٹھنے ہی نہیں دیتے تھے، بڑی مشکل سے آیا ہوں۔' پھر ہم سب ہال کے اندر داخل ہوئے۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ ہال آدھا ہو چکا ہوگا لیکن کوئی بندہ کھسکا ہی نہیں اور جیسے ہی وہ منچ پر پہنچے آوازیں لگنے لگیں:

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

اس کے بعد کئی بار اُن کا دہلی آنا ہوا اور جے این یو میں جو میٹنگ سیتارام یچوری نے کروائی، اس میں ہزاروں کی تعداد میں اُن کے شائقین پہنچے۔ فیض نے اپنے چاہنے والوں سے انتظار تو ضرور کروایا، لیکن ان کے کلام نے انہیں کبھی مایوس نہیں کیا۔ کتنے بھی مشکل حالات ہوں ان کے شعروں کی 'چاندی دمکتی' رہی۔

اگر پاکستان فیض کی بیوی تھی تو ہندستان اُن کی محبوبہ۔ ان کے دل میں ہر اس انسان کی عزت تھی جو انسانیت کا پرچم لیے نیک راہ پر چل رہا ہو، اور جب ایسے انسانوں پر ظلم ہوتا تو ان پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی اور وہ اپنے درد کے رشتے کے اصرار پر قلم چلانا شروع کر دیتے۔ فیض کا عالمی نقطۂ نظر کوئی تھوپا ہوا لوہے کا خول نہیں تھا۔ وہ ان کی بے لوث سمجھ کا حصہ تھا، ظلم سے ہر جگہ ٹکرانے کے لیے تیار۔

فیض کی 'دو نظمیں فلسطین کے لیے' کا جائزہ لیجیے، ذرا بھی تو ان میں مصنوعیت ظاہر نہیں ہوتی،

* ڈاکٹر کنور محمد اشرف نہ صرف جدوجہد آزادی میں نمایاں رول ادا کرتے رہے بلکہ ایک قابل فخر مورخ کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔

ان کی نظم 'فلسطینی بچے کے لیے لوری' ایک دلفگار شاہکار ہے۔ کون سا دل ہے جو ان مصرعوں کو پڑھ کر تڑپ نہ اٹھے:

مت رو بچے
امی، ابا، باجی، بھائی
چاند اور سورج
تو گر روئے گا تو یہ سب
اور بھی تجھ کو رلوائیں گے
تو مسکائے گا تو شاید
سارے ایک دن بھیس بدل کر
تجھ سے کھیلنے لوٹ آئیں گے

'ایرانی طلبا کے نام' ان کی ان نظموں میں سے ہے جو انقلابی ادب میں اپنی جگہ رکھتی ہے، جب ان جیالوں پر گولی چلی اور ان میں سے بے شمار مارے گئے تو اس درد کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے اس قیدی نے اپنے دل کی گہرائی میں محسوس کیا:

یہ کون سخی ہیں
جن کے لہو کی
اشرفیاں، چھن چھن، چھن چھن،
دھرتی کے پیہم پیاسے
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی ہیں

اور پھر ادھر بھی نظر ڈالیں:

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بُجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گُل کریں تو ہم جانیں

ہمارا چاند کبھی گُل نہ ہوگا، ہم کل چلے جائیں گے مگر فیض کی انقلابی شاعری آنے والی نسلوں کو پیغام دیتی رہے گی — حق کا، جدوجہد کا اور انسانی دوستی کا۔

فیض اپنے خطوط کے آئینے میں

ظہور صدیقی

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تیری عاقبت سنوار چلے

'صلیبیں مرے دریچے میں' یہ مجموعہ ہے ان خطوط کا جن کو فیض نے پاکستان کے دیگر جیل خانوں سے اپنی بیوی ایلس کے نام لکھے۔ فیض اور مرزا ظفر الحسن نے مل کر ان کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا۔ یہ پورا ترجمہ اعلیٰ معیار کا ہے۔ سب سے پہلے 'اُتر گا تھا' کا فیض نمبر، جو ان کے انتقال کے بعد منظرِ عام پر آیا تھا، میں یہ مضمون شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد 'نیا چھ' نے تھوڑی بہت کانٹ چھانٹ کے بعد اس کو اپنے خصوصی نمبر میں دوبارہ شامل کیا اور اب یہ مضمون اردو رسم الخط میں، کچھ ترمیم کے ساتھ، آپ کے سامنے ہے۔

فیض نے ایک اچھی خاصی عمر (1984-1911) پائی لیکن ان کی تحریریں اور تقریریں دونوں ہی کم رہیں۔ وہ نہ لکھتے زیادہ تھے اور نہ بولتے زیادہ تھے: اپنے بارے میں باتیں کرنے سے یا لکھنے سے وہ ہمیشہ کتراتے رہے۔ ان ہی کے الفاظ میں: 'اپنے بارے میں باتیں کرنے سے مجھے

سخت وحشت ہوتی ہے۔اس لیے کہ سب بور لوگوں کا مرغوب شغل یہی ہے'اور فیض پر سب چھوڑ دیا جاتا تو صرف ان کے شعر ہی دکھائی پڑتے اور شاید ان کی بھی تعداد اتنی نہیں ہوتی اگر وہ جیل نہیں گئے ہوتے۔دورِ اسیری میں ان کے فکر و قلم کی جنبش ہوتی رہی،اور نہایت ہی اعلیٰ پیمانے کا شعری ادب سامنے آیا۔جہاں تک جیل سے لکھے گئے خطوط کا تعلق ہے ان کو ایک کتابی شکل میں لانے کا کام خصوصی طور پر مرزا ظفر الحسن نے کیا تھا۔فیض کے خطوط کو'صلیبیں مرے دریچے میں' ترتیب دینا مرزا مرحوم کا ہی کارنامہ تھا،جو بقول فیض ان کے 'سر پر سوار ہو گئے'۔بیش قیمت خطوط کا یہ مجموعہ جون 1971 میں شائع ہوا۔ان کے پہلے خط (7 جون 1951) سے کتاب چھپوا کر تیار ہونے کی مدت کا فاصلہ بیس سال کا ہے۔دو دہائیوں تک یہ خطوط ایلس نے محفوظ رکھے جو فیض سے ان کے پیار کی اور ادب کے تئیں ان کی ذمہ داری کی ایک بہترین مثال ہے۔

فیض کی شخصیت کے مختلف پہلو تو 'صلیبیں مرے دریچے میں' اُجاگر ہوتے ہی ہیں،لیکن اس کتاب میں جمع کیے گئے خطوط ان کے ماحول اور شاعری کو سمجھنے میں بھی بے حد معاون ہیں۔جہاں تک فیض کا سوال ہے تو انہوں نے کبھی بھی خود کو بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کیا۔اپنی خامیوں کو اکثر و بیشتر گناتے رہے۔وہ اپنی شاعری کی کبھی تشہیر نہیں کرتے نظر آتے،اور یہی شانِ بے نیازی ان کے خطوط کے اس مجموعہ میں بھی نمایاں ہے۔وہ لکھتے ہیں:'ظاہر ہے کہ یہ کوئی ادبی تصنیف نہیں ہے، نجی خطوط ہیں،جو قلم اٹھا کر لکھے گئے ہوں۔کسی مربوط اور سنجیدہ بحث کی تلاش بیکار ہے'۔کیا خوب! لیکن اس طرح کی باتیں انہوں نے بار بار کہی ہیں۔اگر یہ خطوط ادبی تخلیق نہیں ہیں تو دنیا کا کوئی ادب،ادب نہیں ہے۔ان میں کیا نہیں؟ صحیح بات تو یہ ہے کہ ان میں بہت سے ایسے جملے آتے ہیں جو ان کے مختلف اشعار پر بھاری ہیں۔ان جملوں میں زندگی ایک مکمل صورت اختیار کیے ہوئے ہے جس میں درد کی کسک بھی ہے،جدوجہد کی لے بھی ہے اور آنے والی صبح کا پیغام بھی۔ایک دلکش طرزِ اسلوب ہے جو دلوں میں اترتا جاتا ہے لیکن بیچ بیچ میں زندہ دلی بھی ہے اور مزاح بھی۔کچھ نمونے اس طرح ہیں:

18 اگست 1951 کا خط

حیدر آباد (سندھ) جیل میں فیض یوں چہکتے ہیں:

'یہاں رنج دہ بات صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ ریت اور مٹی کی وجہ سے سب لوگ گنجے ہوتے جا رہے ہیں۔مجھے ڈر ہے کہ یہاں سے باہر ہونے تک ہماری سب 'سیکس اپیل' ختم ہو چکی ہوگی،یہ بہت ہی المناک واقعہ ہوگا۔اس کے بعد ہم پر تہمتیں تراشنے والے بیچارے کیا کریں گے؟ آخر ایک بوڑھے گنجے بزرگ کے بارے میں کوئی کیا اسکینڈل ایجاد کر سکتا ہے'۔

22 جنوری 1952 کا خط

'اب میں یہاں کے اوّل درجے کے کھلاڑیوں میں ہوں اور اس بات سے کچھ اطمینان ہوتا ہے کہ چالیس برس کے باوجود بدن زیادہ چٹخنے یا کڑکڑانے کے بغیر اب بھی تیزی سے دوڑ بھاگ سکتا ہے،اگرچہ وہ پہلی سی بات نہ سہی۔یہ عمر کا احساس بیان کرنا ذرا مشکل ہے۔ہم سب پر عمر کا غلبہ ایسے چُپکے چُپکے ہوتا ہے کہ کبھی مشکل ہی سے ذہن میں آتا ہے کہ ہم بیس برس پہلے سے بہت زیادہ مختلف ہو گئے ہیں۔اپنا نقشہ جو اپنے ذہن میں ہوتا ہے وقت کے ساتھ اتنا کم بدلتا ہے کہ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ باقی دنیا کے لیے بھی یہ نقشہ ویسا ہی برقرار ہے،یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ عمر نے بدن کے ہر نقش پر خرابی اور زوال کی کتنی لکیریں کھینچ دی ہیں۔اسی خود فراموشی کی وجہ سے جب بڑے بوڑھے، نوجوانوں کی سی چُہلیں کرتے ہیں تو بالکل الّو نظر آتے ہیں۔انہیں اپنے آپ میں وہ تغیر بالکل دکھائی نہیں دیتا جو باقی سب کی نظروں پر عیاں ہوتا ہے۔کل جب میں اچکن پہن کر ناشتہ کے لیے پہنچا (جیل خانے کی ناجائز کمائی سے فضول خرچی کر کے میں نے اس خیال سے ایک عمدہ گرم اچکن بنوائی ہے (کہ نہ جانے قید خانے سے باہر اس کے لیے دام میسر آئیں یا نہ آئیں) تو کسی نے کہا آپ جوانی میں واقعی خوبصورت ہوں گے۔اگر ایک سال پہلے یہی بات کوئی کہتا تو ہم جواب دیتے کیا بکتے ہو،ہم اب بھی جوان ہیں۔لیکن کل یہ بات سنی تو ہم صرف مسکرا دیے اور اسی بات سے دل خوش ہو گیا کہ کسی نے ہماری جوانی کی تعریف تو کی وہ اگرچہ رخصت ہو چکی ہے لیکن ہے تو اپنی ہی'۔

7 جولائی 1953 کا خط

کان کے درد، جس کے علاج کے لیے پاکستان کی سرکار نے انہیں حیدر آباد کی جیل سے کراچی جیل بھیجا، کو جس انداز سے انہوں نے بیان کیا ہے وہ اپنا جواب نہیں رکھتا۔ شاید ہی کوئی اردو کا ادیب ہو جس نے دل کے درد اور جگر کے درد کا رونا نہ رویا ہو لیکن کان کے درد کو جس بلندی پر فیض لے گئے ہیں وہ ان کے قلم کا جادو ہے۔ لکھتے ہیں:

'مجھے یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا ہے اور اس دوران ہم بقول بخاری (پطرس بخاری) صاحب سیزرین کے سوا باقی سب کچھ جھیل چکے ہیں۔ خون کا دباؤ اب معمول پر ہے اور کان اور دانتوں کے سوا اور کوئی شکایت نہیں، لیکن خدا گواہ کہ آدمی کی خانہ ویرانی کو یہی کیا کم ہیں۔ مرض تو خیر اپنی جگہ ہے۔ میں علاج کی بات کر رہا ہوں جو مرض سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے۔ نازیوں نے ایذا رسانی اور عذاب دینے کے جو طریقے اختیار کیے تھے ان کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہے لیکن انمیں 'عذاب گوش' کا کہیں ذکر نہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے محبوب مشغلے میں پوری طرح ماہر نہیں تھے ورنہ عذاب وایذا کی جو صورت یہ عضو پہنچاتا ہے بالکل لاثانی ہے۔ ''عذاب دنداں'' تو خیر مسلمہ اور جانی پہچانی چیز ہے لیکن اس کے مقابلے میں ہیچ ۔ جیسا تم

جانتی ہو اُف کیے بغیر درد برداشت کرنے میں ہم کسی سادھو سنت سے پیچھے نہیں، لیکن اب کے میں نے محسوس کیا ہے کہ صبح کان پر کوئی مشق ناز کرے اور سہ پہر کو دانتوں پر تو یہ کچھ زیادتی ہی ہے۔'

اس سے پہلے کہ ہم تکلیف دہ باتوں تک پہنچیں، لگے ہاتھوں فیض کی زبانی ایک لطیفہ بھی ہو جائے جس کو انہوں نے 26 مئی 1952 کے خط میں لکھا ہے:

'تمہیں شاید یہ قصہ میں نے سنایا تھا کہ گزشتہ بار جب میرا سیالکوٹ جانا ہوا تو ایک پرانے اسکول کے ہم جماعت سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اس سے کہا— چلو ذرا اپنے محلے کا ایک چکر لگا آئیں۔ وہ کہنے لگے: 'تو پھر بہت سے کھلونے ساتھ لے چلو۔' پوچھا: 'وہ کس لیے؟' کہنے لگے: 'اب وہ سب نانیاں، دادیاں ہوگئی ہیں۔'

18 مارچ 1953 کا خط

جیل کی زندگی روح کو کتنی گھلانے والی ہوتی ہے، اس کی عکاسی فیض نے اس طرح کی ہے:

'جب غلیظ، زرد دیواروں، دھول اور مٹی، زنجیروں' چہروں' وردیوں اور سب لعنتی چیزوں پر نظر پڑتی ہے جسے جیل خانہ کہتے ہیں، تو یکا یک کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ موج در موج، کراہیت اور بے زاری کا سیلاب اندر سے اٹھتا ہے جس میں اپنی ذات اور باقی ہر چیز غرق ہو جاتی ہے۔'

فیض نے کہیں کہیں جیل کی چبھتی ہوئی زندگی کو دردناک الفاظ میں ضرور پیش کیا ہے لیکن ناامیدی ان کے قلم پر حاوی نہیں ہو پائی۔ ناامیدی ان کی خاصیت کبھی بھی نہیں بن پائی۔ درد کو درد تو ضرور کہیں گے لیکن ان کے بوجھ سے بیٹھ نہیں جائیں گے۔ تاریک اندھیرے میں بھی وہ بجھے ہوئے چراغوں سے روشنی پیدا کرتے رہے:

'پھر ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ کوئی ننھا سا بیج سیاہ بوجھل مٹی کو بہت سلیقے سے ہٹا کر ایک ننھی سی کونپل زمین سے برآمد کرتا ہے اور اسے دیکھ کر دل بے پناہ اور ناقابل بیان مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے اور تمام وقت دل جانتا ہے کہ اسی سبز کونپل کے ننھے ہاتھوں میں حقیقت بھی ہے اور ابدیت بھی۔ جیل کی دیواریں، پہریدار اور وردیاں سب جھوٹ ہیں، سب غیر حقیقی ہیں۔'

جیل کے پڑاؤ کے دوران فیض کے کومل وحساس دل کو کئی کراری چوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی ان کے پیارے ان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ ان میں ان کے بڑے بھائی طفیل تھے، ایلس کے باپ تھے، رشید جہاں تھیں، منٹو تھے۔ روزن برگ جوڑے پر جو گزری، لگتا ہے کہ وہ فیض پر ہی گزر رہی تھی اور جب انسانی برادری کے لیے ان کا پیار اُمڈ کر آتا ہے تو کوریا اور ایران کے شہیدوں کی یاد ان کے دل پر آری چلا جاتی ہے۔

17 جولائی 1952 کا خط

اپنے بڑے بھائی طفیل احمد خاں کی اچانک موت کی خبر سننے کے لیے فیض بالکل تیار نہیں تھے۔ ان کے دل پر جو گزری وہ اس خط میں صاف نظر آتا ہے:

'آج صبح میرے بھائی کی جگہ موت میری ملاقات کو آئی۔ سب لوگ بہت مہربانی سے پیش

آئے۔ یہ لوگ میری زندگی کی عزیز ترین متاع مجھے دکھانے لے گئے، وہ متاع جو اب خاک ہو چکی ہے اور پھر وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

میں نے اپنے غم کے غرور میں سر اونچا رکھا اور کسی کے سامنے نظر نہیں جھکائی۔ یہ کتنا مشکل، کتنا اذیت ناک تھا، صرف میرا دل جانتا ہے۔

اب میں اپنی کوٹھری میں اپنے غم کے ساتھ تنہا ہوں۔ اب مجھے سر اونچا رکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں اس غم کے بے پناہ ظلم سے ہار مان لینے میں کوئی تذلیل نہیں ہے۔'

طفیل احمد خاں فیض کے بڑے بھائی تھے جو حیدر آباد (سندھ) کی جیل میں ان سے ملنے کے ارادے سے آئے تھے لیکن ملاقات سے پہلے 17 جولائی 1952 کی صبح دل کا دورہ پڑنے سے فجر کی نماز پڑھتے ہوئے ان کی موت ہو گئی۔

9 اگست 1952 کا خط

ڈاکٹر رشید جہاں کے مرنے کی خبر جب انہیں اخبار سے ملتی ہے تو اس بیکراں رنج و غم کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

'رشیدہ کے ماسکو میں مرنے کی خبر کل پڑھی۔ اگر میں جیل سے باہر ہوتا تو شاید زار و قطار روتا۔ لیکن اب تو رونے کو آنسو ہی باقی نہیں رہے۔ اس حادثے کا سن کر رونے دھونے کے بجائے دل پر عجیب مُردنی سی چھائی رہی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اب کے موت رات کے رہزن کی طرح اچانک بے اطلاع نہیں آئی تھی یا شاید اپنے لاشعور میں یہ خیال بھی ہو کہ مرنے والی کی بہادر روح بیکار اور بزدلانہ غم واندوہ کو پسند نہیں کرے گی۔ جب سے اس کی مہلک بیماری کا سنا تھا، دل میں بہت شدت سے تمنا تھی کہ کاش وہ ہمارے باہر آنے تک زندہ رہے اور ہم سب ساتھ اس سے ملنے کے لیے جا سکیں۔ اسے بچوں سے بہت پیار تھا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ ہمارے بچوں کو دیکھے گی تو کتنا خوش ہو گی۔ افسوس کہ موت کے خلاف اس کی طویل جنگ اتنی جلد ختم ہو گئی۔ اس کے جانے سے ہمارے برِصغیر سے نیکی اور انسان دوستی کی بہت بڑی دولت چھن گئی اور اس کے دوستوں کی محرومی کا

کیا کہیے جن کی زندگیاں اس کے ایثار و مروت سے اس قدر آسودہ اور مزین ہوئیں۔'

27 جنوری 1955 کا خط

منٹو کی وفات بھی فیض کے لیے کچھ کم جان لیوا نہیں تھی۔ ان کے الفاظ میں:

'منٹو کی وفات کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ سب کمزوریوں کے باوجود مجھے نہایت عزیز تھے اور اس بات پر مجھے کچھ فخر بھی ہے کہ وہ امرتسر میں میرے شاگرد تھے۔ اگرچہ یہ شاگردی کچھ برائے نام ہی تھی اس لیے کہ وہ کلاس میں تو شاید ہی کبھی آتے ہوں۔ البتہ میرے گھر پر اکثر صحبت رہتی تھی اور چیخوف، فرائڈ اور موپاساں اور نہ جانے کس کس موضوع پر گرم مباحثے ہوتے تھے۔ بیس سال گزر چکے لیکن یوں لگتا ہے جیسے کل کی بات ہے۔ ہمارے شرفاء جنہیں دورِ حاضر کے فنکار کی شکستِ دل کا نہ احساس ہے نہ اس سے کوئی ہمدردی، غالباً یہی کہیں گے کہ منٹو مر گیا تو اس کا اپنا قصور ہے۔ بہت پیتا تھا، بہت بے قاعدہ زندگی بسر کرتا تھا۔ صحت کا ستیاناس کر لیا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ کوئی نہیں سوچے گا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ ایسے ہی کیٹس نے بھی اپنے کو مار رکھا تھا۔ برنز نے بھی، موزارٹ نے بھی اور بھی کئی نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب معاشرتی حالات کی وجہ سے فن اور زندگی ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوں تو دونوں میں سے ایک کی قربانی دینی ہی پڑتی ہے۔ دوسری صورت سمجھوتہ بازی کی ہے جس میں دونوں کا کچھ حصہ قربان کرنا پڑتا ہے اور تیسری صورت ان دونوں کو یکجا کر کے جد و جہد کا مضمون پیدا کرنے کی ہے جو صرف عظیم فنکاروں کا حصہ ہے۔ منٹو عظیم نہیں تھا لیکن بہت دیانت دار، بہت ہنر مند اور قطعی راست گو ضرور تھا۔'

22 مئی 1954 کا خط

*روزن برگ جوڑے کی دردناک مصیبت جو اخیر میں ان کو چھین کر لے گئی، فیض کے لیے ایک

---

* یو ایس اے کی عدالتِ عالیہ نے، سب سے پہلے، صدر ٹرومین کے عہد میں ایتھل اور جولیس روزن برگ جوڑے کو موت کی سزا سنائی، اور بعد میں آیزن ہاور نے بھی اس سزا کو برقرار رکھا اور اس طرح 19-6-1953 کو انہوں نے بجلی کی کرسی پر بیٹھ کر جامِ شہادت پیا۔ فیض نے اس عظیم حادثے سے متاثر ہو کر اپنی لافانی نظم 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے' تخلیق کی۔ ۔مدیر

ایسا خنجر تھا جو ان کے کلیجے میں اتار دیا گیا ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

'میں نے روزن برگ جوڑے کے خطوط ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالے۔ اگر چہ بار بار دل زیادہ بھر آیا تو کتاب ہاتھ سے رکھنی پڑی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے الفاظ کا سوز اور ان کی عظمت اسی ادیب کو نصیب ہو سکتی ہے جس کی مرگ وحیات ایسی ہی عظیم اور درد انگیز ہو۔ ان کا اور ان کے بچوں کا خیال آتا ہے تو اپنی مصیبت کی بات کرنا (اگر چہ یہ مصیبت بھی کچھ کم نہیں) بے ہودہ پن معلوم ہوتا ہے۔'

18 اکتوبر 1952 کا خط

بڑے بھائی کا غم فیض کو کافی دنوں تک ستاتا رہا جو ایک فطری بات تھی لیکن انہوں نے اس درد کو کوریا کے جیالوں سے جوڑ دیا۔ ان کے ہی الفاظ میں:

'شاید ایسی کسی صبح میں اسی چاند نے اسی جگہ سے تھوڑے سے فاصلے پر ایک تنہا مسافر کو پکارا تھا اور اسے کسی نامعلوم دنیا میں اپنے ساتھ لے گیا تھا، اور وہ مسافر میرا بھائی تھا۔ شاید اس وقت یہی چاند ایسے بہت سے چہروں پر چمک رہا ہے جو مر کر درد سے آزاد ہو چکے ہیں۔ کوریا کے کیمپوں میں مقتول قیدیوں کے چہرے اور یہ سب مقتول نوجوان بھی میرے بھائی تھے۔ جب وہ زندہ تھے تو ایسی دور دراز سرزمینوں پر زندہ تھے جو میں نے نہیں دیکھیں لیکن وہ میرے تن میں بھی زندہ تھے اور میرے لہو میں ان کا لہو بھی شامل تھا، جن قاتلوں نے انہیں قتل کیا ہے، انہوں نے میرے تن کا کوئی حصہ قتل کیا ہے اور میرا بھی کچھ لہو بہایا ہے۔'

جیل کی سلاخیں ہی فیض کے زخموں کو جھیلنے کے لیے کافی تھیں، پر موتوں کے اس لاوے نے ان کے دل کو غموں کی بھٹی بنا دیا تھا۔ ہر وہ پیاری ہستی جو ان کے دل میں جگہ بنائے ہوئے تھی ان سے دور سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ کوریا میں بربریت اور ایران کے طلبا پر دمن آگ میں گھی کا کام کر رہا تھا۔ فیض ان حادثات کے درمیان اخیر میں بے چین ہوئے، تڑپے بھی، سسکے بھی اور جب جذبات قابو سے باہر ہوتے نظر آئے تو ان کی آنکھیں بھی بھر آئیں اور یہ فطری ردِ عمل تھا۔ غم کی ایک چنگاری میں بھسم کرنے کی طاقت ہوتی ہے، کتنے لوگ جلتی ہوئی چتا بن جاتے ہیں، پر فیض نے غموں

کی بھٹی سے اس لاوے کو نکال کر اور اپنے الفاظ کو اسی سے ڈھال کر ایسی تصنیفات پیش کیں جن کو ہزاروں قیامتیں بھی تہس نہس نہیں کر پائیں گی۔ سچائی جو چوٹ کھائے ہوئے دل کی گہرائی سے نکلتی ہے، وہ امر ہوتی ہے۔ ایک ملک کی بات نہیں جہاں بھی صبح بغاوت کا گلشن پھوٹے گا، جہاں بھی 'عشاق کے قافلے' نکلیں گے اور جہاں بھی 'لہو کی تال' گونجے گی، 'ایرانی طلبا کے نام'، 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے' اور 'آ جاؤ افریقہ' جیالوں کے ہونٹوں پر نکھرتے رہیں گے۔

فیض کے خطوط کی جان ہیں زندگی کے صحت مند اقداروں کے نغمے۔ اپنے 'پہلے' خط (7 جون 1951) میں وہ انسانوں کی صحبت کو دنیا کی سب سے عزیز چیز بتاتے ہیں۔ خط میں لکھتے ہیں:

'اپنے چاہنے والوں کو کسی چیز کی خاطر دکھ اور اذیت پہنچانا، جو خود کو بہت عزیز ہو لیکن ان کے لیے کچھ معنی نہ رکھتی ہو، غلط اور ناجائز بات ہے۔ اس نظر سے دیکھو تو آئیڈیل ازم یا اصول پرستی بھی خود غرضی کی ایک صورت بن جاتی ہے۔ اس لیے کہ اپنے کسی اصول کی دھن میں آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ دوسروں کو کیا چیز عزیز ہے اور اس طرح اپنی خوشنودی کی خاطر دوسروں کا دل دکھاتے ہیں۔'

ان کا یہ 'پہلا' خط ان الفاظ کے ساتھ ختم ہوتا ہے:

'اور یہ یقین پہلے سے بھی زیادہ محکم ہو چلا ہے کہ زندگی خواہ کچھ بھی دکھائے، بالآخر بہت خوبصورت شے بھی ہے اور بہت حسین بھی۔'

30 اکتوبر 1951 کا خط

فیض اپنی شادی کی دسویں سالگرہ پر لکھتے ہیں:

'جو لمحہ حق وصداقت کی پرورش میں گزرے وہ بجائے خود خوشی کا ایسا خزینہ بن جاتا ہے جسے کوئی رہزن لوٹ نہیں سکتا۔ نہ کوئی جابر ضبط کر سکتا ہے۔'

فیض اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

'خوابوں کو حقیقت کی زنجیروں سے آزاد نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے آدمی تخیل کے بل پر گرد وپیش کی دلدل سے پاؤں چھڑا سکتا ہے۔ فراریت بری بات ہے لیکن

جب ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے ہوں تو آزادی کی واحد صورت یہی رہ جاتی ہے۔ اسی نسخے کے طفیل مجھے جیل کی سلاخیں بہت ہی حقیر اور بے حقیقت دکھائی دینے لگی ہیں اور بیشتر اوقات ان کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔'

15 جنوری 1953 کا خط

'بالآخر اپنی تسکین کا سرچشمہ، اپنی ہی نیکی اور اچھائی ہوتی ہے جس کا وجود اس زمانے تک برحق ہے جب تک دنیا میں نیکی اور اچھائی کا وجود باقی ہے اور دنیا میں یہ ضرور باقی ہے۔ اسی کے سبب سارے زمانے کی دشمنی کے باوجود بہت سے لوگ دوستی کرنے کے لیے بھی مل جاتے ہیں اور ہر معرکے میں آخر کار جیت نیکی اور دوستی کی ہی ہوتی ہے۔'

22 جنوری 1952 کا خط

'طنزیہ تحریر میں ایک بات کی احتیاط لازم ہے اور وہ یہ کہ تلخی یا حقارت ظرافت یا مزاح پہ غالب نہ ہو جائے ورنہ تحریر میں بدمزاجی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔'

اسی خط میں وہ کہتے ہیں:

'سچائی اور انصاف کی جیت تو آخر کار مقدر ہے اور اسی پر تکیہ کرنا چاہیے۔ امید افزا افواہوں پر بھروسہ فضول ہے لیکن ان سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ ہوا کا رُخ کدھر ہے اور لوگ کیا چاہتے ہیں۔ اپنے ضمیر کے علاوہ نیکی اور برائی کی کوئی عدالتِ عالیہ ہے تو وہ یہی رائے عامہ ہوتی ہے۔'

اسی خط کے اخیر میں فیض کہتے ہیں:

'اور یہ چند روز کتنے ہی طویل کیوں نہ ہوں، آخر چند ہی روز ہیں۔'

25 مارچ 1952 کا خط

'اگر لڑائی میں اپنا پلّہ بہت کمزور ہو تو پھر آدمی بددلی اور کم ہمتی afford نہیں کر سکتا بہ ظاہر یہ بات غیر منطقی معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل صحیح ہے۔ زندگی کی جدوجہد میں صرف جدوجہد ہی کافی

نہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان یہ لڑائی بشاشت اور خوش طبعی سے لڑے اور اپنے پر دردمندی اور ترحم کے جذبات نہ طاری ہونے دے ورنہ غنیم کا پلّہ اور بھی گراں بن جاتا ہے۔'

22 اپریل 1952 کا خط

'انفرادی رنج و ملال کے ایسے اسباب بھی بہت ہیں جو تھوڑی سی محبت، شفقت و ہمدردی اور سمجھ بوجھ سے اگر دور نہیں کیے جا سکتے تو کمزور کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن محبت اور شفقت کی طلب میں پکارنے والے اتنے زیادہ ہیں اور دینے والے اتنے کم کہ دردِ جگر اور شکستِ دل کا مداوا دور دور تک نظر نہیں آتا۔ بہر حال اس کی تلاش میں تگ و دو پھر بھی لازم ہے اور جیسا کہ تم نے لکھا ہے، اپنی بھلائی اسی میں ہے کہ آدمی دوسروں سے نیکی کرتا رہے۔ البتہ اس کے عوض میں کسی صلے یا احسان مندی کی توقع نہ رکھنی چاہیے ورنہ یقیناً مایوسی کا سامنا ہوگا۔ اگر آدمی نیکی کے عوض میں نیکی کی توقع رکھے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ دنیا کا نظام بجائے خود نیک ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سوچ غلط ہے، اس لیے کہ ایک نیکوکار نظام میں سبھی کو نیک ہونا چاہیے اور کسی کو خاص طور سے نیکی کرنے کے لیے زحمت اٹھانے کی ضرورت نہ ہونی چاہیے۔'

6 نومبر 1952 کا خط

'اگر اپنا دل بڑا ہو تو اسے اس وجہ سے چھوٹا نہیں کرنا چاہیے کہ کسی دوسرے کا دل چھوٹا ہے۔ دوستوں کے بارے میں اپنے مغالطے یا خوش فہمی دور کر لینا اچھی بات ہے لیکن ان کے چھوٹ جانے پر اپنا دل جلانا یا ان پر یہ الزام دھرنا کہ وہ تمہاری خوش فہمیوں کے مطابق ثابت نہیں ہوئے، صحیح بات نہیں ہے۔ کسی کے بارے میں خوش فہمی یا مغالطہ تو اپنی ہی خطا ہوتی ہے نہ کہ دوسرے کی جو کوئی جیسا بھی ہے اُسے ایسا ہی قبول کر لینا چاہیے۔ اس سے قطعِ نظر کہ تمہارے خیال میں اسے کیسا ہونا چاہیے تھا، اور کسی سے بھی زیادہ توقع وابستہ نہیں کرنی چاہیے۔'

Printed at Tarang Printers, F-40 Site "C" Surajpur Industrial Area
Greater Noida, U.P

10 نومبر 1952 کا خط

'دنیا میں دُکھ اتنا زیادہ ہے اور اپنا اختیار اتنا کم کہ اس دُکھ سے نمٹنے کے لیے اپنی پوری ہمت درکار ہے۔ اسی سبب امید کی شمع جلائے رکھنا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔'

اسی خط میں:

'ہم دوسروں کو رنج و خوشی برداشت کرنے میں بھی جب ہی امداد دے سکتے ہیں جب ہم اپنی ناخوشی کو قابو میں رکھیں۔ کسی دوسرے کو خوش کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ آدمی خود خوش نظر آئے۔ یہ بسا اوقات مشکل تو ہوتا ہے لیکن کرنا بھی چاہیے۔'

* * *

اس طرح، فیض کا یہ خطوط کا مجموعہ 'صلیبیں میرے دریچے میں' زندگی کا پیغام دیتا ہے۔ زندگی فیض کو بہت عزیز تھی۔ بد سے بدتر حالات میں وہ اسی کے گیت گاتے رہے اور آج مٹی میں دبے ہونے کے باوجود ان کا رشتہ اس سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ وہ کل بھی زندہ تھے اور آج بھی زندہ ہیں۔ چاند کو کون گُل کر سکتا ہے؟

فیض اردو کے ممتاز شاعر ہیں۔ ان پر ابھی بہت کچھ اور بھی لکھا جانا باقی ہے اور یہ سلسلہ صد سالہ جشن کے ساتھ قطعی ختم نہیں ہوگا۔ آنے والے وقتوں میں فیض دانشوروں سے ہم کلام ہوتے رہیں گے۔ ان کے بارے میں، ان کے شعری شعور کی پرواز کو لیکر، اور ان کے فکر میں ڈوبے ہوئے جملوں کی وسعت پر چرچے ہوتے رہیں گے اور یہ سب کچھ ایک زبان یعنی اردو تک ہی محدود نہیں رہے گا۔ دنیا کی زبانیں ان کے شعروں کے قریب آتی جائیں گی۔ فیض کی زندگی میں بھی مختلف زبانوں نے ان کے شعروں کو اپنے ادب میں جگہ دی۔ ہندی کے قلمکاروں نے بھی نہ صرف ان کے اشعار کو چوما بلکہ اس پر لکھنا بھی شروع کیا اور جو لکھا بہت خوب لکھا۔ اب اس کی ایک جھلک قارئین کو اس کتاب میں نظر آئے گی۔

اردو کے قارئین جب ان ترجمہ شدہ مضامین کو دیکھیں گے تو نہ صرف یہ انہیں معیاری لگیں گے بلکہ دلنواز بھی۔ ان مضامین کے لکھنے والوں میں سے بیشتر ہندی ادب کے نامی گرامی رائٹرس ہیں۔ ان کے مضمون میں فیض کے اشتراکی خیالات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہاں شاعر کی انسان دوستی ابھر کر نظر آتی ہے اور استحصالی نظام سے اس کی نفرت بھی۔

اس کتاب کے مرتب و مترجم ظہور صدیقی 1959 سے دہلی یونیورسٹی سے منسلک رہے۔ پہلے بطور طالب علم کروڑی مل کالج سے تواریخ میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ مشہور مورخ ڈاکٹر کنور محمد اشرف کی سعادت، پھر پروفیسر ستیش چندر کی قیادت میں ریسرچ کی شروعات اور بعد میں 1964 سے بطور معلم اپنے فرائض انجام دیتے رہے، زندگی کے مختلف شعبوں سے جڑے ہوئے: تواریخ نویسی، صحافت، ادبی مذاکرات، سماجی افادیت، فروغ تعلیم، حقوق معلم، تخلیقی سیکولرزم، جمہوری اقدار، شعور اور عمل کو قریب تر لانے کیلئے کوشاں، ہمسایہ ممالک کے عوام میں دوستی کے خواہاں جیسے موضوعات پر انہیں دسترس حاصل ہے۔

ISBN978-81-237-6262-3

قیمت: 100.00

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

Printed at Tarang Printers, F-40 Site "C" Surajpur Industrial Area
Greater Noida, U.P